بِسۡمِ اللّٰہِ مَجۡرٖىہَا وَمُرۡسٰىہَا ؕ (۱۱/۴۱)

طُوفانِ نُوحؑ

سفینہؑ برگِ گُل بنالے گا قافلہ مُورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش، مگر یہ دریا سے پار ہوگا

شجرۂ طیبہ اصلها ثابت و فرعها فی السماء ۱۴/۲۴

حضرت نوحؑ (سنہ ۵۰۰۰ ق.م)

یافث — سام — حام

اقوامِ عاد و ثمود (حضرت ہود و صالح علیہما السلام)

(حضرت ابراہیمؑ سنہ ۲۳۰۰ ق.م) (حضرت لوط علیہ السلام آپکے برادر زادہ)

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام — (حضرت اسحٰق علیہ السلام) — مدیان

- حضرت اسمٰعیل علیہ السلام
  - قیدماہ (اصحاب الرس)
  - نبایوط (اصحاب الحجر)
  - آفتابِ رسالت حضور ختمی مرتبت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
- (حضرت اسحٰق علیہ السلام)
  - عیسو (ادوم)
    - عوض
      - حضرت ایوب علیہ السلام (سنہ ۱۰۰۰ ق.م)
    - عمالق
  - حضرت یعقوب علیہ السلام (اسرائیل)
    - (حضرت موسیٰ علیہ السلام) و (حضرت ہارونؑ سنہ ۱۴۰۰ ق.م)
    - حضرت داؤد علیہ السلام سنہ ۱۰۰۰ ق.م
    - حضرت سلیمان علیہ السلام
    - حضرت یونس علیہ السلام (سنہ ۸۰۰ ق.م)
    - حضرت زکریا علیہ السلام } قربِ زمانہ حضرت عیسیٰؑ
    - حضرت یحییٰ (علیہ السلام) }
- مدیان
  - حضرت شعیبؑ (سنہ ۱۶۰۰ ق.م)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حضرت نوح علیہ السلام

دُورافقِ مُبین پر، تاروں کی چھاؤں میں، انسانی رشد و ہدایت کی آسمانی قندیلیں ہاتھ میں لئے نورانی پیکروں کا جو مقدس قافلہ دکھائی دیتا ہے، قرآنِ کریم نے اس کے تذکرۂ جمیلہ کی ابتداء حضرت نوحؑ سے کی ہے۔

آج دنیا کے گوشے گوشے میں انسانوں کی آبادی نظر آتی ہے لیکن دنیا شروع سے اسی طرح آباد نہیں چلی آئی۔ علمائے تاریخ الامم رفتہ رفتہ اثری انکشافات سے اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ نسلِ انسانی کا اوّلیں سرچشمہ کسی ایک مقام پر تھا۔ جہاں سے اس کی سوتیں پھوٹیں اور ندیوں اور دریاؤں کی شکل میں اطرافِ عالم میں بہ نکلیں۔

وَ اللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۙ (۷۱/۱۷)

اور اللہ نے تم کو زمین سے نباتات کی طرح پھیلایا[1]

---

[1] اس سے مراد سلسلۂ ارتقا کی رُو سے نسلِ انسانی کا ظہور پذیر ہونا بھی ہے۔

انسانی آبادی کا اوّلین سرچشمہ

قیاس کیا جاتا ہے کہ انسانی آبادی کا یہ اوّلین سرچشمہ جھیل کیسپین [illegible] کے اطراف و جوانب میں واقع تھا. اس قیاس کے ماتحت علم الاقوام والسنہ کے محققین نے اقوامِ عالم کو مختلف مماثلت و مشابہت کی بنا پر، تین شاخوں میں تقسیم کیا ہے.

(۱) آریائی (ایرین) مثلاً ہندی اقوام، ایرانی اور فرنگستانی.

(۲) تورانی (منگولین) مثلاً ترکستانی، چینی.

(۳) سامی (سمیٹک) مثلاً عرب، آرامی، عبرانی، سریانی، کلدانی وغیرہ.

بعض علمائے انساب، اقوامِ عالم کی تقسیم اختلافِ رنگ کی بنا پر کرتے ہیں، یعنی سفید فام (مثلاً اُمِ سامیہ اور فرنگی)، سیاہ فام یا سرخ فام (باشندگانِ افریقہ) اور زرد فام (جاپانی اور چینی وغیرہ). ان کے برعکس، تورات کا بیان ہے کہ طوفانِ نوحؑ کے بعد جب انسانوں کی نئی زندگی شروع ہوئی تو نسلِ انسانی حضرت نوحؑ کے تین بیٹوں یافث (JAPHETH)، حام (HAM) اور سام (SHEM) سے آگے بڑھی اور موجودہ اقوامِ عالم انہی کی یادگار ہیں. ان تینوں نسلوں میں سے تورات کو صرف سامی نسل (SEMITIC RACE) سے تعلق ہے کیونکہ انبیائے کرامؑ کا وہ سلسلہ جس کا ذکر تورات میں ہے اسی خاندان سے متعلق تھا.

بنی سام کا مولد و مسکن

بنی سام کی اس قوم کا مولد و مسکن کونسا علاقہ تھا، یہ مسئلہ علمائے تاریخ کے نزدیک اہم مباحث کا مرکز رہا ہے. اگرچہ تاریخ کی قدیم ترین کتابوں میں اس موضوع پر بہت کچھ ملتا ہے لیکن اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اثری انکشافات نے بحث و نظر کا رُخ اس طرح بدل دیا ہے کہ اب بیسویں صدی میں یہ مسئلہ گویا متحقق ہو چکا ہے کہ اُمِ سامیہ کا اوّلین وطن ملکِ عرب تھا، جہاں سے نکل کر وہ بابل، سیریا، مصر اور فینیشیا تک پھیل گئے. اس تحقیقات سے یہ اہم حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آ رہی ہے کہ اُمِ سابقہ اور مِلَلِ قدیمہ کی تاریخ و تمدن میں عرب کو کیا اہمیت حاصل رہی ہے، یعنی مصر و شام، فلسطین و عراق وغیرہ کی یہ تمام قومیں، جنہیں الگ الگ سلسلہ کہا جاتا ہے، درحقیقت ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں ہیں جو سرزمینِ عرب سے اُبھرا. اس اعتبار سے ان تمام اقوام کی زبانوں کی اصل بھی عربی زبان کی قدیم شکل قرار پائے گی. یہ امور

ہنوز اُن انکشافات کا نتیجہ ہیں جو معرضِ شہود میں آچکے ہیں۔ کیا معلوم آگے چل کر ان میں کیا کیا اضافے ہوتے چلے جائیں گے جن سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ قرآنِ کریم نے بالتخصیص انہی اقوام اور انہی انبیائے کرامؑ کا ذکر کیوں کیا ہے؟ ہو سکتا ہے (اور قرائن اس پر شاہد ہیں) کہ مزید انکشافات سے انسانی آبادی کی موجودہ تقسیم (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) سمٹ سمٹا کر اس ایک نقطہ میں مرکوز ہو جائے کہ ان تمام اقوامِ عالم کی ابتدا ریگستانِ عرب ہی سے ہوئی، جہاں کے شہر مکہ کو قرآنِ کریم اُمّ القریٰ (آبادیوں کی ماں) قرار دیتا ہے۔ بہرحال آج یہ قریب قریب متحقق ہو چکا ہے کہ سامی اقوام کا مولدِ اوّل عرب[2] تھا جہاں سے وہ

قومِ نوحؑ کا مولد

اطراف و حوالی میں پھیلیں۔ ان اقوام کے مورثِ اعلیٰ، حضرت نوحؑ کے بیٹے تھے۔ اس لئے قومِ نوحؑ کا وطن بھی انہی علاقوں میں تھا۔ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ حضرت نوحؑ کی کشتی جودی پہاڑ پر جا کر ٹھیری۔ تورات نے اس کا نام "ارارط" بتایا ہے جس کے متعلق خیال ہے کہ وہ آرمینیہ کے سلسلۂ کوہ میں واقع ہے۔ اس سلسلۂ کوہ سے دجلہ و فرات (TIGRIS AND EUPHRATES) بہتے ہوئے جنوب کی طرف آتے ہیں اور خلیجِ فارس کے کچھ اوپر آپس میں مل کر اس میں گر جاتے ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ قومِ نوحؑ کا وطن دجلہ و فرات ہی کا درمیانی علاقہ تھا۔

اور زمانہ

اب رہا یہ کہ اس قوم کا زمانہ کونسا تھا؟ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ قومِ عاد، قومِ نوحؑ کی جانشین (SUCCESSOR) تھی۔ (دیکھئے ۷/۶۹)

قومِ عادؑ کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ وہ اُممِ سامیہ اُولیٰ کا سب سے وسیع قبیلہ تھا جس کی شوکت و عظمت کی داستانوں کا نشان قدیم تاریخوں سے ملتا ہے۔ اس قبیلہ نے عرب[2]، بابل اور مصر میں بڑی بڑی سلطنتیں قائم کیں۔ عاد کا زمانہ تین ہزار سال ق.م سے پیشتر کا متعین کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یوں سمجھئے کہ قومِ نوحؑ کا زمانہ کوئی چار پانچ ہزار سال قبل مسیح (یا آج سے چھ سات ہزار سال پیشتر) کا تھا۔ اس لئے کہ ایک شخص (سام) کی اولاد کو قوم بننے اور پھر اتنی شوکت و عظمت حاصل کرنے کے لئے اُس زمانہ میں ہزار پندرہ سو سال کی مدت تو درکار ہو گی۔ بہرحال یہ قیاس و تخمین ہے جس کی بنیاد علمائے تاریخ

---

[1] اس باب میں ریّان کا بیان، ابلیس و آدمؑ کے آخری باب میں دیا جا چکا ہے۔

[2] عرب سے مراد موجودہ حجاز ہی کا علاقہ نہیں۔

واثریات کی تحقیقات پر ہے۔ قرآنِ کریم تاریخ اور جغرافیہ کی کتاب نہیں۔ یہ نوعِ انسانی کے لئے ضابطۂ ہدایت ہے اور قوموں کے عروج و زوال اور زندگی اور موت کے اصول پیش کرتا ہے۔ چنانچہ اس میں اقوام و ملل کا تذکرہ بھی اسی ضمن میں آیا ہے۔ بایں ہمہ، یہ بھی حقیقت ہے کہ ان تمام اقوامِ قدیمہ کے متعلق (جن کی بابت، اور تو اور، خود عربوں کے پاس بھی عمومی اور سطحی تعارف کے سوا، معلومات کا کچھ ذخیرہ نہ تھا) تاریخی واثری انکشافات سے جو کچھ ابھر کر سامنے آرہا ہے وہ ان خطوط و نقوش کے خلاف نہیں جن کا اجمالی تذکرہ

قرآنی حقائق اور تاریخی شواہد

قرآنِ کریم میں ہے، بلکہ ان کی تائید و تصدیق کرتا چلا جارہا ہے۔ اور اصل یہ ہے کہ جہاں کہیں حقیقت کی نمود ہوگی، ہو نہیں سکتا کہ وہ قرآن کے کسی اجمالی یا تفصیلی بیان سے مختلف ہو۔ اس لئے کہ قرآن یکسر حقیقتِ ثابتہ ہے۔ اس میں ظن و تخمین اور ریب و تشکیک کی کہیں گنجائش نہیں۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ علمی تحقیقات کی روشنی میں جہاں دیگر مذاہب کے عام "مسلّمات" افسانوں میں تبدیل ہوتے چلے جارہے ہیں، قرآنی اجمالات کی توثیق و تصدیق ہوتی چلی جاتی ہے۔ دنیا کو ابھی اور علمی ترقی کرنے کے دیجئے۔ وہ خود بخود دیکھ لے گی کہ قرآن کا یہ دعویٰ کس قدر حقیقت پر مبنی ہے کہ

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ (۴۱/۵۳)

وہ وقت دور نہیں کہ ہم انہیں خارجی کائنات اور خود ان کی نفسیاتی دنیا (یا عربوں کے اپنے اندر اور ان کے باہر کی اقوام میں) اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے تا آنکہ یہ بات نکھر کر سامنے آجائے کہ قرآن ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔

حضرت نوحؑ کی بعثت اپنی قوم کی طرف

یہ تھی وہ قوم جس کی طرف حضرت نوحؑ مبعوث ہوئے۔ انسان کے عہدِ طفولیت میں سلسلۂ آمد و رفت اور ذرائع رسل و رسائل ایسے محدود تھے کہ جو قبیلہ جہاں موجود تھا ایک مستغنی عن الغیر وحدت (SELF-CONTAINED UNIT) تھا جسے باہر کی دنیا کے ساتھ بہت کم واسطہ پڑتا تھا۔ اس لئے حضرات انبیاء کرامؑ کی تعلیم کا دائرہ بھی اس خاص قبیلہ یا قوم تک محدود ہوتا تھا، جس میں وہ تشریف لاتے تھے۔ چنانچہ حضرت نوحؑ کے متعلق فرمایا:۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝

(۷/۵۹ نیز ۱۱/۲۵؛ ۲۳/۳۳؛ ۲۹/۱۴؛ ۱۰/۷۱)

یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ اس نے کہا، "اے میری قوم! صرف قانونِ خداوندی کی اطاعت کرو۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو ایک بڑے ہی (ہولناک) دن کا عذاب تمہیں پیش نہ آجائے۔

حضرت نوحؑ بھی اسی قوم کے ایک فرد تھے۔ اس لئے انہیں ان لوگوں کا بھائی کہا گیا ہے۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ (۲۶/۱۰۶)

"اور جب ان کے بھائی نوح نے ان سے کہا، "کیا تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت نہ کرو گے"

ویسے بھی، قبائل کی تقسیم نسلی امتیاز پر ہوتی تھی اور ایک قبیلہ (یا تھوڑی سی وسعت کے بعد قوم) ایک ہی مورثِ اعلیٰ کی اولاد پر مشتمل ہوتا تھا اس لئے قبائل کے نام بھی یا اُن کے جدِ اولیٰ کے نام پر ہوتے تھے یا اس قبیلہ کی کسی عظیم الشان شخصیت کی طرف منسوب۔ قرآنِ کریم سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ

نوحؑ اپنی قوم میں پہلے رسول نہیں تھے

اپنی قوم میں پہلے رسول نہیں تھے بلکہ آپ کی قوم آپ سے پہلے بہت سے رسولوں کی تکذیب کر چکی تھی اور حضرت نوحؑ کا زمانہ وہ تھا جس میں خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق اس قوم کے جرائم کے ظہورِ نتائج کا وقت آچکا تھا۔ سورۂ شعراء میں ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ِ الْمُرْسَلِیْنَ ۝ (۲۶/۱۰۵)

قومِ نوح نے رسولوں کی تکذیب کی۔

اسی طرح سورۂ فرقان میں ہے۔

وَ قَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَ جَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰیَةً ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِیْنَ عَذَابًا اَلِیْمًا ۝ (۲۵/۳۷)

اور جب قومِ نوح نے رسولوں کی تکذیب کی تو ہم نے ان کو غرق کر دیا اور (آنے والے) انسانوں کے لئے ایک مثال بنا دیا اور قانونِ مکافات کی رُو سے ظالموں کے لئے دردناک تباہی کا عذاب

تیار رہتا ہے۔

اس سے یہ بھی واضح ہے کہ اس قوم کی طرف سے تکذیبِ رُسل اُن کی غرقابی سے پہلے ہو چکی تھی (یعنی یہ نہیں کہ قومِ نوحؑ کے بقیہ افراد کی آیندہ نسلوں نے تکذیبِ رُسل کی تھی جس کی طرف مندرجہ صدر آیات میں اشارہ کیا گیا ہے)۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خود حضرت نوحؑ کے زمانہ میں اس قوم کے مختلف حصّوں میں بیک وقت بہت سے حضرات مرسلین تشریف لائے ہوں (جیسے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ ایک ہی وقت میں مبعوث ہوئے تھے)۔ بہرحال یہ رسول حضرت نوحؑ سے پیشتر مبعوث ہوئے ہوں یا آپ کے ہمعصر ہوں، قرآن سے یہ ظاہر ہے کہ غرقابیٔ قومِ نوح کے وقت ان کی قوم کی حالت یہ تھی کہ وہ اللہ کے قوانین کے خلاف زندگی بسر کرتی تھی۔

وَ قَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝ (۵۱/۴۶)

اور اس سے قبل نوح کی قوم تھی۔ وہ لوگ قانونِ خداوندی کے خلاف زندگی بسر کرتے تھے۔

قومِ نوحؑ کی حالت

اور جیسا کہ ظاہر ہے اس فسق و عصیان کا نتیجہ سرکشی اور ظلم تھا۔

وَ قَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَ اَطْغٰى ۝ (۵۳/۵۲)

اور اس سے قبل نوح کی قوم کے لوگ سرکش اور ظالم تھے۔

ان لوگوں نے خدائے واحد کی عبودیت کو چھوڑ کر کھلی ہوئی بُت پرستی اختیار کر رکھی تھی۔ چنانچہ جب حضرت نوحؑ نے انہیں خدائے واحد کی طرف دعوت دی تو اُن کی قوم کے سرغنوں نے قوم سے کہا کہ

وَ قَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَ لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّ لَا سُوَاعًا ۙ وَّ لَا يَغُوْثَ وَ يَعُوْقَ وَ نَسْرًا ۚ (۷۱/۲۳)

انہوں نے کہا کہ اپنے معبودوں کو مت چھوڑو اور وَدّ اور سواع اور یغوث اور نسر دیوتاؤں کو مت ترک کرو۔

دعوتِ حضرت نوحؑ اور توحید

یہ تھے وہ حالات جن کے اندر حضرت نوحؑ تشریف لائے۔ آپ نے ان لوگوں کو سب سے پہلے خدائے واحد کی عبودیت اختیار کرنے کی دعوت دی کہ یہی پیغام حضرات انبیاء کرامؑ کی دعوت کا سنگِ بنیاد ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ

مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ (۷/۵۹)

یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوح کو اس قوم کی طرف (تبلیغِ حق کے لئے) بھیجا تھا۔ اس نے کہا "اے میری قوم! اللہ ہی کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے سوائے کوئی الٰہ نہیں۔

سورۂ ہود میں ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ ۫ اِنِّیْ لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۙ۬ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ اَلِیْمٍ ۝ فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ ۚ وَ مَا نَرٰى لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِیْنَ ۝ (۱۱/۲۷-۲۵) نیز (۲۳/۲۴)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ اس نے کہا (لوگو!) "میں تمہیں (انکار و بدعملی کے نتائج سے) کھلے کھلے الفاظ میں آگاہ کرتا ہوں۔ اللہ کے سوا اور کسی کی اطاعت و محکومیت اختیار نہ کرو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا ایک دردناک دن نہ آجائے۔ اس پر قوم کے سرداروں نے جن کے ہاں مال و دولت کی افراط تھی اور اس وجہ سے انہوں نے قوانینِ خداوندی سے انکار کی راہ اختیار کی تھی کہا، ہم تم میں اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھتے کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو اور جو لوگ تمہارے پیچھے چلے ہیں ان میں بھی ان کے سوا کوئی دکھائی نہیں دیتا جو ہم میں پست درجے کے ہیں اور بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے ہو لئے ہیں۔ ہم تو تم لوگوں میں اپنے مقابلے میں کوئی برتری نہیں پاتے۔ ہمیں یقین ہے کہ تم اپنے اس دعوے میں جھوٹے ہو۔

خدا کی محکومیت

یہ دعوتِ نوحی کا اوّلیں اور اساسی اصول تھا۔ یعنی خدا کے سوا اور کسی کی محکومیت اختیار نہ کریں۔ حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی عملی شکل یہ ہے کہ اس کے مرکز کی اطاعت کی جائے۔ اس لئے حضرت نوحؑ نے فرمایا کہ

اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ۙ۬ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ۝ (۲۶/۱۰۷-۱۰۸) ؛ (۳/۷۱)

میں اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا (حکومتِ الٰہیہ کا) امانت دار ہوں۔ پس اللہ سے ڈرو اور میری

(بہ حیثیتِ مرکزِ اوّل) اطاعت کرو۔

انقلابی دعوت

دعوتِ نوحی کی تعلیم کے ان عناصر پر بھی غور فرمایئے۔ یہ تعلیم کیا تھی؟ اس مسلک کے خلاف ایک کھلا ہوا چیلنج جو اس قوم کے آبا و اجداد (اسلاف) سے متوارث چلا آتا تھا اور ان کے سرداران یعنی اربابِ ثروت و حکومت کے تغلّب و اقتدار کے خلاف بے غل و غش بغاوت! تاریخِ انسانیت کے ادراق کو اُلٹتے جایئے۔ حق و باطل کی کشمکش میں یہی دو مقام ہیں جو ہمیشہ قبولیتِ حق و صداقت کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہوتے ہیں۔ معتقدات، خواہ کس قدر غلط کیوں نہ ہوں، جب آبا و اجداد سے منتقل ہو کر آئیں تو انسان کے نزدیک ایسے گراں بہا متاع بن جاتے ہیں جنہیں وہ اپنے قلب کی انتہائی گہرائیوں میں چھپائے رکھتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اُن کے چھننے

تقلیدِ آباء

سے اس کی ساری کائنات لُٹ رہی ہے لیکن کسی عقیدہ کے صحیح ہونے کا یہ معیار کس قدر غلط ہے کہ وہ اسلاف سے وراثتاً منتقل ہو کر آیا ہے! اگر تہِ دق کے جراثیم، جو انسان کو اپنے آبا سے وراثتاً ملے ہوں، یقیناً اس قابل ہیں کہ جس قدر جلد ہو سکے انہیں تلف کر دیا جائے، تو معتقدات کے جراثیم ایسے مقدس کیوں تصوّر کر لئے جائیں کہ ان کی پرورش خونِ قلب و جگر سے کی جائے! حق و باطل کے پرکھنے کا معیار وہ کسوٹی ہے جو اللہ کی طرف سے وحیٔ مبین کی شکل میں انسانی رشد و ہدایت کے لئے ملتی ہے۔ اپنے ذاتی خیالات و تصوّرات کو بھی اسی کی روشنی میں پرکھئے اور ان معتقدات کو بھی جو نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلے آتے ہوں۔ لیکن انسان کی اس شوریدہ بختی کو کیا کیجئے کہ وہ ہر پرانی (قدیم) چیز کو تقدّس کا لبادہ اڑھا دیتا اور اسے تنقید کی حد سے بالاتر سمجھنے لگتا ہے۔ قرآنِ کریم نے جب سب سے پہلی دعوتِ حق و صداقت کا ذکر کیا تو اس اہم حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ صداقت کے قبول کرنے میں سب سے پہلے کونسا جذبہ مانع ہوتا ہے، یعنی اسلاف پرستی کا جذبہ، کورانہ تقلید کا مسلک۔ آپ دیکھینگے کہ حضرت نوحؑ سے لے کر حضور خاتم النبیینؐ تک ہر داعیٔ حق و صداقت کی آواز کے جواب میں یہی کچھ کہا جاتا رہا کہ چونکہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ ہمارے آبا و اجداد کی روش کے خلاف ہے، اس لئے ہم اسے قبول نہیں

ہر زمانہ میں یہی لغزش کی گھاٹی رہی ہے

کر سکتے (۱۰/۱۴)۔ اور اسے چودہ سو سال پیشتر تک ہی محدود کیوں رکھئے! کیا آج بھی جب یہ کہا جاتا ہے کہ آؤ! اپنے معتقدات و تصوّرات کو قرآنِ کریم کی روشنی میں پرکھ کر دیکھیں تو اس

کے جواب میں کیا وہی پرانی آواز نہیں دہرائی جاتی کہ ہم اسی چیز کو حق سمجھتے ہیں جو اسلاف سے منتقل ہو کر چلی آ رہی ہے اور اس کے خلاف جانے کے لئے ہرگز تیار نہیں ؟ زمانے کے تغیرات سے صرف پیکر بدلا کرتے ہیں، روح تو وہی چلی آتی ہے۔ حق و صداقت کی روح بھی ایک ہی ہے اور اس کے مقابل میں باطل کی طاغوتی روح بھی ایک ہی۔

دوسری رکاوٹ

اعترافِ حق و صداقت کی راہ میں دوسرا سنگِ گراں نشۂ حکومت و سطوت ہے۔ یوں تو انسان ہر شکار میں لذت محسوس کرتا ہے لیکن اس کی لذت کی انتہا اس مقام پر پہنچ کر ہوتی ہے جہاں اس کا شکار خود دوسرا انسان ہو۔ تاریخِ عالم پر نگاہ ڈالئے۔ یہ صید و صیاد کی ایک مسلسل داستان نظر آئے گی جس میں ہر زمانہ اور ہر مقام میں کمزور اور ناتواں انسان، زبردست اور قوی انسانوں کے پنجۂ تغلّب و تسلّط میں تڑپتے، پھڑکتے، سسکتے، بلبلاتے، سکراتِ موت کی ہچکیاں لیتے دکھائی دیں گے۔ حضرات انبیائے کرامؑ کی بعثت کی سب سے اہم غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ ان کمزور اور ناتواں انسانوں کو جابر و ظالم انسانوں کے پنجۂ استبداد سے چھڑا کر آزادی کی فضائے بسیط میں چھوڑ دیں جہاں وہ پوری سرفرازی و سربلندی سے "انسانوں" کی طرح چل پھر سکیں اور انسان اور خدا کے درمیان کوئی دوسری

صحیح آزادی کی دعوت

طاقت حائل نہ ہو اور اس طرح وہ اپنے آپ کو ایک اللہ کے قانون کے سوائے کسی اور کا محکوم نہ پائیں۔ ظاہر ہے کہ اربابِ حکومت و تسلّط اپنے شکار کو آسانی سے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ وہ پوری کوشش کریں گے کہ اس قسم کی انقلاب انگیز آواز کا گلا اپنے آہنی ہاتھوں سے گھونٹ دیں۔ وہ اپنی ابلیسانہ سیاست کا ہر حربہ استعمال کریں گے کہ ان کے دامِ تغلّب کے حلقے کمزور نہ ہونے پائیں۔ داعیانِ حق و صداقت کی راہ میں یہ دوسرا مرحلہ ہے جس سے تصادم و تزاحم ضروری ہے۔ قرآنِ کریم نے جس دعوت کا سب سے پہلے ذکر کیا ہے اس کے ساتھ ہی اس تصادم کا ذکر بھی کیا ہے۔

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰۗىِٕكَةً ۚ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَاۗىِٕنَا الْاَوَّلِيْنَ ۝ (۲۳/۲۴)

اس کی قوم کے جن سرداروں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی وہ یہ سُن کر (لوگوں سے) کہنے لگے کہ

یہ آدمی اس کے سوا کیا ہے کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہے؟ مگر چاہتا ہے، تم پر اپنی بڑائی جتلائے۔ اگر اللہ کو کوئی ایسی ہی بات منظور ہوتی تو کیا وہ فرشتے نہ اتار دیتا؟ (وہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی کو اپنا پیامبر کیوں بنانے لگا؟) ہم نے اپنے اگلے بزرگوں سے تو کوئی ایسی بات کبھی سُنی نہیں۔

اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ یہ تصادم اس سلسلۂ آسمانی کے ساتھ ہر مقام پر رہے گا، کہ جیسا کہ "ابلیس و آدم" میں بتایا جا چکا ہے، ابلیس نے قیامت تک کے لئے مہلت لے رکھی ہے، اس لئے خدائی نظام کے ساتھ طاغوتی نظام ہمیشہ برسرِ پیکار رہے گا۔ بقول اقبالؒ:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

سرمایہ دار گروہ کی طرف سے مخالفت

آگے بڑھنے سے پیشتر، ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآن نے ان مخالفین کے لئے اَلْمَلَاُ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کے لفظی معنی ہیں وہ لوگ جن کے گھروں میں برتن بھرے ہوئے ہوں، یعنی وہ جنہیں سامانِ زیست کی فراوانیاں حاصل ہوں، جن کے پاس کثرت سے مال و دولت ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنی دولت کے زور سے اقتدار کی کرسیاں حاصل کر لیتے ہیں اور پھر غریب انسانوں سے اپنا حکم منواتے ہیں۔ اسی کا نام (دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں) نظامِ سرمایہ داری ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ آسمانی انقلاب جس کے داعی حضرات انبیائے کرامؑ تھے، اسی غیر خداوندی نظام کو مٹانے کے لئے آتا تھا جس میں رزق کے سرچشمے انسانوں کے قبضے میں رہتے ہیں۔ وہ ان ذرائع رزق کو انسانوں کے ہاتھوں سے چھین کر، قانونِ خداوندی کے سپرد کر دیتا ہے، تاکہ اس سے تمام نوعِ انسانی کی پرورش ہو سکے۔ اس انقلاب کی مخالفت سب سے پہلے ان لوگوں کی طرف سے ہوتی ہے جو رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضہ میں لئے ہوتے ہیں۔ یہی وہ تصادم ہے جس کا ذکر سب سے پہلی دعوتِ انقلاب کے سلسلہ میں سامنے آ رہا ہے (۵۹-۷/۶۴)۔ اس مخالفت کی وجہ بھی سُن لیجئے۔

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا
..... اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ۝ (۲۶-۱۱/۲۸)

اس پر قوم کے سرداروں نے جنہیں مال و دولت کی فراوانی حاصل تھی اور جنہوں نے کفر کی راہ

اختیار کی تھی، کہا کہ ہم تم میں اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھتے کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو اور جو لوگ تمہارے پیچھے چلے ہیں وہ ہم میں نچلے درجے کے ہیں اور بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے ہو لئے ہیں، ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے بلکہ سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو۔

نوح نے کہا، اے میری قوم کے لوگو! تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے دلیلِ روشن لئے ہوں اور اس نے اپنے ہاں سے مجھے وحی کی رحمت بھی عطا کردی ہو، مگر وہ تمہیں دکھائی نہ دے، تو میں اس کے سوا کیا کرسکتا ہوں جو کر رہا ہوں؟ یہ تو ہم کر نہیں سکتے کہ اسے زبردستی تمہارے گلے منڈھ دیں۔

سورۂ شعراء میں ہے۔

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَ اتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ۝ (۲۶/۱۱۱)

(قوم کے سرداروں نے کہا) کیا ہم تمہاری باتوں پر (اے نوح) یقین کرلیں۔ حالانکہ (ہم دیکھ رہے ہیں کہ صرف کمینے (نچلے درجے کے لوگ) تمہارے پیچھے ہو لئے ہیں؟

ان آیات پر غور فرمایئے۔ مخالفت اس طبقہ کی طرف سے ہوئی جو صاحبِ دولت و ثروت تھا اور وجوہاتِ مخالفت میں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کیا ہم اس جماعت کے ساتھ ہو جائیں جو رذیل لوگوں پر مشتمل ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ حق و صداقت کی دعوت پر لبیک، سب سے پہلے غریب طبقہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ اربابِ ثروت و حکومت کے جور و استبداد سے تنگ آچکے ہوتے ہیں اور ہر اس آواز کا بطیبِ خاطر استقبال کرتے ہیں جو انہیں آزادی اور سچی آزادی کی طرف دعوت دے اور زندگی کی خوشگواریوں سے ہمکنار کردے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوگیا کہ زمانۂ حضرت نوحؑ میں طبقات کی تقسیم وجود میں آچکی تھی، یعنی وہ قبائلی زندگی کا ایسا ابتدائی زمانہ نہیں تھا جس میں انسانی عزت و تکریم، دولت و ثروت کے معیار سے نہ ماپی جائے۔

طبقاتی تقسیم

قَالَ وَ مَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۲۶/۱۱۲)

(حضرت نوحؑ نے) کہا کہ ان کے (پیشہ اور) کام سے مجھ کو کیا بحث۔

اس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ اس وقت انسانوں کی تقسیم پیشوں کے اعتبار سے وجود میں آچکی تھی جو

ذات پات کی تقسیم کا بنیادی پتھر ہے اور جو انسانی مساوات کی جڑ پر ایسی کاری ضرب تھی کہ یہ لعنت انسانوں سے آجتک دُور نہیں ہو سکی۔ حضرات انبیائے کرامؑ کا منصب، مساواتِ انسانی کو قائم کر کے عزّت و عظمت کا معیار تقوٰے قرار دینا تھا، یعنی یہ معیار کہ جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرے اور اس طرح نوعِ انسانی کی پرورش و منفعت کے لئے سب سے زیادہ مفید ثابت ہو، وہی معاشرہ میں سب سے زیادہ عزّت و توقیر کا مستحق ہے۔ چنانچہ حضرت نوحؑ کا جواب اس پر شاہد ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اس سے غرض نہیں کہ یہ لوگ کیا کیا کام کرتے ہیں۔ میرے اور ان کے درمیان وجہ جامعیت ایمان ہے اور میں محض تمہاری خاطر مؤمنین کی جماعت کو دھتکار نہیں سکتا، یعنی اس جماعت کو جو اس کا اقرار اور تہیہ کر چکی ہے کہ وہ خود بھی قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے گی اور انہی قوانین کو معاشرہ میں رائج کرے گی۔

قَالَ وَ مَا عِلْمِیْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۚ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّیْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ۝ وَ مَا اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۚ (۱۱۲ — ۲۶/۱۱۵)

نوح نے کہا ان کے پیشہ اور کام سے مجھ کو کیا بحث؟ ان سے حساب کتاب لینا، خدا کا کام ہے، کیا خوب ہو، جو تم اس بات کو سمجھو اور میں تو یہ کرنے سے رہا کہ تمہاری خاطر اس جماعت کو دھتکار دوں۔ میرا مقصد تو یہ ہے کہ تمہیں غلط زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتا رہوں۔ (نیز ۱۱/۲۹؛ ۱۰/۷۲؛ ۱۰۹/۲۶)۔

اگر میں انہیں اس لئے دھتکار دوں کہ ان کے پاس دولت نہیں تو میں اپنے اللہ کے یہاں مجرم ٹھیرایا جاؤں گا۔ کہیئے! اس وقت مجھے اللہ کی گرفت سے کون بچا سکتا ہے؟ (۱۱/۳۰)۔

یہ لوگ جو بظاہر تمہیں بے کس و بے بس، مفلس و نادار نظر آتے ہیں تمہیں کیا علم ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں کن نعمتوں اور عظمتوں سے نوازنے والا ہے؟ (۱۱/۳۱)۔

اربابِ استبداد کا جواب

اس کے جواب میں قوم نے کیا کیا؟ وہی جو سرکش اور متکبر کیا کرتے ہیں!

قَالُوْا یٰنُوْحُ قَدْ جَادَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۝ (۱۱/۳۲)۔

اس پر ان لوگوں نے کہا، اے نوح! تو نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت جھگڑ چکا۔ (اب ان باتوں

سے کچھ بننے والا نہیں) اگر تو سچا ہے تو جس بات کا وعدہ کیا ہے، وہ ہمیں لا دکھا۔
یعنی تو جو ہمیں بار بار کہتا ہے کہ ہماری غلط روشِ زندگی کا نتیجہ تباہی و بربادی ہوگا، درانحالیکہ ہم نہایت خوشحالی اور فارغ البالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، تو تو اس تباہی کو ہمارے سامنے لے آ۔ بات صاف ہو جائے گی!

اس کے جواب میں حضرت نوحؑ نے کہا۔

قَالَ اِنَّمَا یَاْتِیْکُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَ مَا اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ ۝.....
..... وَ اَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ۝ (۱۱/۳۵-۳۳)

نوحؑ نے کہا، تباہی اور بربادی خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق آیا کرتی ہے تم اسے روک نہیں سکتے۔ اگر اس قانون کے مطابق تم اس مقام تک پہنچ چکے ہو جہاں تباہی آکر رہتی ہے تو پھر میری نصیحت تمہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ تمہارے فیصلے تمہارے نشوونما دینے والے کے قانون کے مطابق ہو کر رہیں گے۔ تمہیں کشاں کشاں اس کی طرف جانا ہے۔

(حکم الٰہی ہوا، اے نوح!) کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس آدمی نے (یعنی نوح نے) اپنے جی سے یہ بات گھڑ لی ہے؟ تو کہدے، اگر میں نے یہ بات گھڑ لی ہے تو میرا جرم مجھ پر، اور تم جو جرم کر رہے ہو (اس کی پاداش تمہارے لئے) میں اس سے بری الذمہ ہوں۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، حضرت نوحؑ خود اسی قوم میں سے تھے۔ زندگی انہی میں گزاری تھی۔ قوم نے اس سے پیشتر ان سے اس قسم کی باتیں کبھی نہیں سُنی تھیں۔ جب انہوں نے اپنی دعوت کی تبلیغ شروع کی تو قوم نے سمجھا کہ یہ (معاذ اللہ) پاگل ہو گیا ہے جو اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کرنے لگ گیا ہے جو نہ ہماری دید میں ہیں نہ شنید میں۔ انہوں نے کہا۔

اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِیْنٍ ۝ (۲۳/۲۵؛ ۵۴/۹)

(اس کے سوا کچھ نہیں کہ) یہ پاگل ہو گیا ہے۔ بس (اس کی باتوں پر کان نہ دھرو) کچھ دنوں تک انتظار کر کے دیکھ لو اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

تخویف و ترہیب

لیکن جب دیکھا کہ اسے جنون نہیں، اپنے مشن سے عشق ہے اور وہ پاگلوں کی طرح بے ربط و بلا مقصد باتیں نہیں کرتا، بلکہ اس کی ہر جنبش ایک خاص قبلہ

مقصود کی طرف منجر ہوتی ہے تو وہ ان اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آئے جو قوت کے نشہ کا آخری حربہ ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ۝ (۲۶/۱۱۶)

اے نوح! اگر تم (اپنے مشن سے) باز نہ آؤ گے تو تمہیں سنگسار کر دیا جائے گا۔

یہ دھمکی انفرادی طور نہیں تھی بلکہ قبیلہ کے سب سے بڑے سردار کی قیادت میں ایک بڑی سازش کے تحت اس کا اعلان ہوا تھا۔

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗٓ اِلَّا خَسَارًا ۝ وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ۝ (۷۱/۲۱-۲۲)

نوحؑ نے کہا کہ اے میرے پروردگار! ان لوگوں نے میرا کہنا نہیں مانا اور ایسے شخص کی پیروی کی جس کے مال اور اولاد نے اسے نقصان ہی زیادہ پہنچایا اور انہوں نے بڑی بھاری سازش کی تدبیر کر رکھی ہے۔

دھمکیوں کے جواب میں....

لیکن کیا ان دھمکیوں سے خائف ہو کر حضرت نوحؑ نے اپنی دعوت چھوڑ دی؟ ایسا کس طرح ہو سکتا تھا! خدا کے بندوں کو کسی طرح کی تخویف و ترہیب ان کے مقصد سے باز نہیں رکھ سکتی۔ ان دھمکیوں کے جواب میں حضرت نوحؑ نے فرمایا۔

اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ۝ (۱۰/۷۱)

اگر تم پر بات شاق گزرتی ہے کہ میں تم میں (دعوت و ہدایت کے لئے) کھڑا ہوں اور قوانینِ خداوندی کے مطابق تمہیں پند و نصیحت کرتا ہوں، تو میرا بھروسہ صرف اللہ پر ہے۔ تم میرے خلاف جو کچھ کرنا چاہتے ہو، اسے ٹھان لو اور اپنے شریکوں کو بھی ساتھ لے لو۔ پھر جو کچھ تمہارا منصوبہ ہو اسے اچھی طرح سمجھ بوجھ لو کہ کوئی پہلو نظر سے رہ نہ جائے۔ پھر جو کچھ میرے خلاف کرنا ہے کر گزرو اور مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو۔ (اور دیکھو آخر کار کیا نتیجہ نکلتا ہے؟)

مخالفت کی انتہا چنانچہ ان کی مخالفت روز بروز بڑھتی گئی۔ حتّٰی کہ حضرت نوحؑ ان کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے اور انہوں نے اپنے رب کو پکارا۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِیْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ۝ (۲۳/۳۹)؛ (۵۴/۱۰)

(اور کہا) خدایا انہوں نے مجھے جھٹلایا ہے۔ پس تو میری مدد کر۔

حضرت نوحؑ کی پکار وہ اس سرکش قوم کی متمردانہ روش سے اس قدر تنگ آچکے اور ان کے انکار و مخالفت سے اس قدر مایوس ہو چکے تھے کہ انہوں نے اپنے اللہ سے التجا کی کہ

وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ (۷۱/۲۶)

اے پروردگار! تو نافرمان لوگوں (کا نام و نشان) صفحۂ زمین پر باقی نہ چھوڑیو۔

اس لئے کہ

اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝ (۷۱/۲۷)

اگر تُو نے ان نافرمان و سرکش لوگوں کو (سلامت) چھوڑ دیا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی (نسل سے پیدا ہونے والی) اولاد بھی (موروثی اور تربیتی اثرات کی وجہ سے) بدکردار و سرکش ہوگی۔

کشتی کی تیاری ابتدا میں اس دعوت کا جمالی پہلو نمایاں تھا۔ آخر میں اللہ کے قانونِ مکافات کے ماتحت اس کا جلالی پہلو سامنے آگیا۔ اِدھر سرکشی و تمرد انتہا کو پہنچ گئی۔ اُدھر قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق مہلت کا زمانہ گذر کر نتیجہ مرتب ہونے کا وقت آگیا۔ حضرت نوحؑ سے ارشاد ہوا کہ ایک کشتی تیار کر لو۔

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۚ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝ (۱۱/۳۶-۳۷)؛ (۲۳/۲۷-۳۰)

اور نوحؑ پر وحی کی گئی کہ تیری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کے سوا اب کوئی ایمان لانے والا نہیں۔ پس جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اس پر (بیکار کو) غم نہ کھا۔

اور (کہا گیا کہ) ہماری نگرانی میں اور ہمارے حکم کے مطابق ایک کشتی بنانا شروع کردے اور ان ظالموں کے بارے میں اب ہم سے کچھ عرض معروض نہ کر۔ یقیناً یہ لوگ غرق ہوجانے والے ہیں۔

قوم کا تمسخر یہ کشتی بنا رہے تھے اور قوم کے سرکش سردار ان کا مضحکہ اڑا رہے تھے۔ حالانکہ ان کا یہ مضحکہ خود ان کی اپنی حالت پر تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اللہ کی گرفت نہیں کس سختی سے پکڑنے والی ہے۔

وَ يَصْنَعُ الْفُلْكَ ق وَ كُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ..... وَ يَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝ (۱۱/۳۹-۳۸)

اور جب کبھی ایسا ہوتا کہ ان کی قوم کا کوئی (سردار) گروہ ان پر سے گذرتا، تو ان کو کشتی بنانے میں مشغول دیکھ کر تمسخر کرنے لگتا۔ نوحؑ کی طرف سے انہیں جواب ملتا کہ اگر تم ہماری ہنسی اڑاتے ہو تو (اڑا لو) اسی طرح ہم بھی (تمہاری بیوقوفیوں پر ایک دن) ہنسیں گے۔ وہ وقت دور نہیں جب تمہیں معلوم ہوجائے گا کون ہے جس پر ایسا عذاب آتا ہے کہ اسے رسوا کرے، پھر دائمی عذاب بھی اس پر نازل ہو۔

ظہورِ نتائج کا وقت کشتی تیار ہوگئی اور عذاب کا وقتِ معین آپہنچا۔ حکم ہوا۔

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا فَارَ التَّنُّوْرُ ..... وَ مَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝ (۱۱/۴۱-۴۰)

(یہ سب کچھ ہوتا رہا) یہاں تک کہ جب وہ وقت آگیا کہ ہماری ٹھہرائی ہوئی بات ظہور میں آئے اور زمین کے چشموں نے جوش مارا تو ہم نے (نوح کو) حکم دیا کہ ہر قسم کے (جانوروں کے) دو دو جوڑے کشتی میں لے لو اور اپنے اہل کو بھی ساتھ لو، مگر اہل میں وہ لوگ داخل نہیں جن کی روش ثابت کر چکی ہے کہ وہ اہلِ ایمان میں سے نہیں۔ نیز ان لوگوں کو بھی لے لو جو ایمان لا چکے ہیں۔ اور نوحؑ کیساتھ ایمان نہیں لائے تھے، مگر بہت تھوڑے آدمی۔

اور اس کے بعد۔

فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝ ..... جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ۝ (۵۴/۱۴-۱۱)۔

پس ہم نے آسمان (بادلوں) کے دروازے برسنے والے پانی سے کھول دیئے اور زمین سے چشمے کھول دیئے، تو اس طرح زمین و آسمان کا پانی اس معاملہ کے لئے جس کا قانونِ مکافات کی رُو سے اندازہ معین ہو چکا تھا ایک جگہ جمع ہو گیا اور ہم نے اُسے (نوح کو) میخوں اور تختوں سے بنی ہوئی کشتی پر سوار کرا دیا۔ وہ ہماری نگرانی میں چل رہی تھی اور غرق ہونے کی سزا ان کے لئے تھی جنہوں نے اس سے انکار کیا تھا۔

زمین سے پانی، آسمان سے پانی، پوری کی پوری وادی لبریز۔ اس کے بعد۔

وَ قِيْلَ يٰاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَ غِيْضَ الْمَآءُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ اسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَ قِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (۱۱/۴۴)

اور (پھر اللہ کا) حکم ہوا کہ اے زمین! اپنا پانی پی لے! اور اے آسمان تھم جا! اور پانی کا چڑھاؤ اُتر گیا اور حادثہ انجام پا گیا اور کشتی، جودی، پر ٹھہر گئی اور کہا گیا کہ ہلاکت اس گروہ کے لئے ہو گئی، جس نے سرکشی اختیار کر رکھی تھی۔

اس طوفانِ بلا کے سامنے سرکش و مغرور قوم اور اس کے وہ تمام ساز و سامان جن کے بل بوتے پر وہ ظلم و استبداد کی زندگی بسر کر رہے تھے خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے اور اس تباہی سے وہی محفوظ رہے جو کل تک بے یار و مددگار اور بے ساز و سامان سمجھے جاتے تھے اور جن کا مضحکہ اڑایا جاتا تھا۔ طوفان تھما۔ کشتی جودی پر جا رکی اور ارشاد ہوا۔

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَ عَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (۱۱/۴۸)

حکم ہوا۔ اے نوح! اب کشتی سے اُترو۔ ہماری جانب سے تجھ پر سلامتی اور برکتیں ہوں، نیز ان جماعتوں پر جو تیرے ساتھ ہیں۔ اور دوسری کتنی ہی جماعتیں ہیں (بعد کو آنے والی) جنہیں ہم (زندگی کی خوشگواریوں سے) بہرہ مند کریں گے۔ لیکن وہ صحیح راہ اختیار نہ کریں گے۔ اس لئے انہیں (پاداشِ عمل میں) ہماری طرف سے عذابِ دردناک پہنچے گا۔

یوں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ اور ان کے "اہل" کو عذابِ الیم سے محفوظ رکھا اور مخالفین کو نیست و نابود

کردیا۔ (۷۶ ـ ۷۷/۲۱)؛ (۷۲ ـ ۷۵/۳۷)۔

اھل کا مفہوم

ان آیات میں " اھل " کے لفظ پر غور کرو۔ یہ اپنے اندر ایک عظیم الشان حقیقت پوشیدہ رکھتا ہے جو تاریخِ انسانیت میں مہمّات اصول میں سے ہے۔ ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ حضرت نوحؑ اور ان کے اہل کو اس عذاب سے محفوظ رکھا گیا۔ عام اصطلاح میں " اہل " سے مراد کنبہ اور خاندان کے افراد ہوتے ہیں۔ لیکن آسمانی لغت میں اس سے مفہوم کچھ اور ہے۔ سورۃ المؤمنون میں اہل میں ایک استثناء (EXCEPTION) ہے۔

فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا...... اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝ (۲۳/۲۷)

پس ہم نے نوحؑ کی طرف وحی بھیجی کہ ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بنا۔ جب ایسا ہو کہ ہمارے حکم کا وقت آجائے اور زمین کے چشمے پھوٹ نکلیں تو کشتی میں (ہر جانور کے) دو دو جوڑے ساتھ لے لے اور اپنے اہل کو بھی۔ مگر اہل کے ایسے لوگوں کو نہیں جن کے لئے پہلے فیصلہ ہو چکا۔ اور دیکھ جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کے بارے میں کچھ ہم سے عرض معروض نہ کیجیو۔ وہ ڈوب کر رہیں گے!

اس کی تفسیر سورۃ نوحؑ میں ان الفاظ سے کر دی گئی ہے۔

رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا ۝ (۷۱/۲۸)

(نوحؑ نے کہا) اے میرے رب میری اور میرے ماں باپ کی حفاظت فرما اور اس کی جو ایمان لاتا ہوا میرے گھر میں داخل ہو اور (ایسے اہلِ خانہ کے علاوہ عام) مومن مردوں اور مومن عورتوں کی اور ظالموں کو جو (ایمان نہیں لاتے) تباہی اور بربادی میں بڑھاتے جائیو۔

اپنوں اور غیروں کا قرآنی معیار

اس سے واضح ہو گیا کہ نظامِ خداوندی میں اہل سے مراد کیا ہے۔ یہاں اپنوں اور غیروں کی تقسیم، نسب اور قرابتداری کی رُو سے نہیں ہوتی بلکہ کفر اور ایمان کی رُو سے ہوتی ہے۔ دعوتِ نوحی میں یہ مقام ایسا بلند ہے جسے قرآنِ کریم نے کھلے کھلے الفاظ میں بیان فرمایا ہے تاکہ یہ اصولی اور اساسی معیارِ تقسیم واضح طور پر سامنے آجائے کیونکہ انسانی تمدّن اور عمرانیت کی صحیح اور غلط تعمیر اسی معیار کے صحت اور سقم پر مبنی ہے۔ ذرا غور کیجئے،

چاروں طرف طوفانِ بلا انگیز موجزن ہے۔

وَ هِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ قف (۱۱/۴۲)

اور (دیکھو) ایسی موجوں میں کہ پہاڑوں کی طرح اُٹھتی ہیں، کشتی انہیں لئے جارہی ہے

بیٹا سامنے آجاتا ہے۔ محبتِ پدری جوش میں آتی ہے۔ آواز دیتے ہیں۔

وَ نَادٰى نُوْحُ ِ ابْنَهٗ وَ كَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَ لَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۱۱/۴۲)

اور نوح نے اپنے بیٹے کو پکارا۔ وہ کنارہ پر (کھڑا) تھا۔ اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہوجا کافروں کے ساتھ نہ رہ۔

بیٹا انکار کرتا ہے اور کہتا ہے۔

قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَ حَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ۝ (۱۱/۴۳)

اُس نے کہا، "میں کسی پہاڑ پر پناہ لے لوں گا۔ وہ مجھے پانی کی زد سے بچالے گا۔" نوح نے کہا (تو کس خیالِ خام میں پڑا ہے) آج اللہ کی ٹھہرائی ہوئی بات سے بچانے والا کوئی نہیں، مگر ہاں وہی جسے اس کی رحمت اپنے آغوش میں لے لے اور (دیکھو) دونوں کے درمیان ایک موج حائل ہوگئی۔ پس وہ انہی میں ہوا جو ڈوبنے والے تھے۔

حضرت نوحؑ بیٹے کی ضد اور حماقت کے انجام سے واقف ہیں۔ وہ اس کے انجام (تباہی و غرقابی) کے تصور سے گھبرا اُٹھتے ہیں۔ عرض کرتے ہیں۔

وَ نَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَ اِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَ اَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ۝ (۱۱/۴۵)

اور نوحؑ نے اپنے پروردگار کو پکارا اور کہا، خدایا میرا بیٹا تو میرے اہلؑ میں ہے اور یقیناً تیرا وعدہ

لہ سورۂ نوح کی آیت (۷۱/۲۸) جو پہلے درج کی جاچکی ہے اور جس میں حضرت نوحؑ نے صرف انہی "اہلِ خانہ" کی مغفرت کی دعا کی ہے جو صاحبِ ایمان ہوں، زیرِ نظر واقعہ کے بعد کی معلوم ہوتی ہے۔

سچا ہے تجھ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں۔

اس درخواست کے جواب پر غور فرمایئے کہ یہی جواب تاریخِ انسانیت میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کرنے والا تھا۔ ارشاد ہوا۔

قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنِّىْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ (۱۱/۴۶)

(خدا نے) کہا' اے نوح! وہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔ وہ تو (سرتاپا) عملِ بد ہے (یعنی جب وہ تیری راہ پر نہ چلا اور بدعملوں کا ساتھی ہوا، تو فی الحقیقت تیرے حلقۂ قرابت سے باہر ہوگیا۔ اب اسے اپنا نہ سمجھ) پس جس حقیقت کا تجھے علم نہیں اس بارے میں سوال نہ کر میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ ناواقفوں میں سے نہ ہو جانا۔

نسلی امتیاز اور قوموں کی تقسیم

واقعہ تو اتنا سا ہے لیکن اس کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ آپ یونہی آگے نہ بڑھ جائیں بلکہ اس پر مزید غور کریں کہ اس کے اندر کس قدر عدیم النظیر حقیقت مضمر ہے۔ تاریخِ انسانیت پر غور کیجئے۔ جب انسانوں نے غاروں اور درختوں کی ابتدائی انفرادی زندگی سے آگے بڑھ کر قبائل کی اجتماعی زندگی شروع کی تو ان میں وجہِ جامعیت اشتراکِ نسل تھی، یعنی ایک مورثِ اعلیٰ کی اولاد مل جل کر اکٹھی رہتی تھی۔ اس کا نام قبیلہ تھا۔ یہاں ایک قبیلہ، وہاں دوسرا قبیلہ۔ باہمی مفاد کے تصادم پر ان قبائل میں جنگ و پیکار کے مظاہرے بھی رونما ہوتے رہتے تھے۔ اس جنگ میں حریف و حلیف ہونے کا معیار حق و باطل کا معیار نہ تھا، بلکہ اپنے قبیلہ اور غیر قبیلہ کا معیار تھا، یعنی قبیلہ کا ہر فرد اپنے قبیلہ کے ساتھ ہوتا تھا اور دوسرے قبیلہ کا مخالف۔ یہ تھی انسان کی ابتدائی زندگی۔ اب ہزاروں سال کی تاریخ کے اوراق کو الٹ کر اپنے زمانہ میں پہنچ جایئے جو علم و تمدن کے اعتبار سے اپنے آپ کو ابتدائی دورِ جہالت سے اتنا مختلف سمجھتا ہے۔ جتنا انسان اپنے آپ کو حیوان سے مختلف قرار دیتا ہے۔ لیکن ذرا غور کیجئے کہ جہاں تک تقسیمِ انسانی کا تعلق ہے اس دورِ تہذیب و تمدن کا انسان اُس دورِ

آج کی تقسیم

جہالت و ظلمت کے انسان سے کچھ بھی مختلف ہے۔ وہاں انسانوں کی تقسیم' قبائل کی رُو سے ہوتی تھی' یہاں وہ تقسیم اقوام کی رُو سے ہوتی ہے۔ اور قوم کیا ہے؟ قبیلہ

کی پھیلی ہوئی شکل۔ یعنی جب ایک قبیلہ بڑا ہو جائے تو اُسے قوم کہا جاتا ہے۔ قوموں کی ابتدائی تقسیم اختلافِ نسب کی رُو سے ہوئی، (مثلاً ایرانی، تورانی، سامی) یا اختلافِ رنگ کی بنا پر (مثلاً سفید، سیاہ اور زرد اقوام)۔ اس بنیادی تقسیم سے آگے بڑھئے، تو چھوٹی چھوٹی تقسیمیں جغرافیائی حدود کی رُو سے طے پاتی ہیں، یعنی کسی دریا یا پہاڑ کی حدود کے اندر بسنے والے لوگ دوسری قوم۔ غور فرمایئے! بایں ہمہ ادّعائے تہذیب و تمدّن، انسان ابھی تک اسی چکّر میں گرفتار ہے جہاں سے اس نے اپنی تمدّنی زندگی کی ابتدا کی تھی۔ ذرا یورپ کی تقسیمِ اقوام پر نگاہ ڈالئے اور پھر ان کی سبعیت و بہیمیت اور وحشت و درندگی پر غور کیجئے۔ کیا آپ کو آلاتِ حرب و ضرب کی نوعیت اور سامان و ذرائع تباہی و بربادی کی ساخت و پرداخت کے علاوہ اُس دورِ جہالت اور اِس دورِ تمدّن میں کچھ بھی فرق نظر آتا ہے؟ کچھ بھی نہیں! اس لئے کہ انسانی ہیئت اجتماعیہ سے متعلق مسائل کا صحیح حل صرف وحی کی روشنی میں مل سکتا ہے اور یورپ اس روشنی سے محروم ہے۔ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ۔ (۲/۱۵)

نیشنلزم کی لعنت

آج یورپ جس جہنّم کے عذاب میں گرفتار ہے اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اس نے احترامِ آدمیت کے بجائے قومیت پرستی (NATIONALISM) کو اپنا شعارِ زندگی بنا رکھا ہے، جس کی وجہ سے یہ دنیا انسانوں کی بستی کے بجائے درندوں کا بھٹ بن کر رہ گئی ہے۔ یورپ اس قومیت پرستی کے ہاتھوں کس قدر تنگ آچکا ہے، یہ ہم سے نہیں بلکہ خود یورپ والوں کی زبان سے سنئے۔ الفریڈ کوبن اپنی کتاب (THE CRISIS OF CIVILISATION) میں لکھتا ہے۔

> قومیت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ہوتا ہے اور عداوت پر پرورش پاتا ہے۔ ایک قوم کو اپنی ہستی کا احساس ہی اس وقت ہوتا ہے، جب وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ہو۔ پھر ان اقوام کا جذبۂ عداوت و پیکار اپنی قومی وحدت کی تکمیل پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ جوں ہی کوئی قوم اپنے حقِ استقلال و خود مختاری کو مسلّط کر لیتی ہے تو پھر ان اقوام کو دبانا شروع کر دیتی ہے جو اپنے لئے خود مختاری کی مدعی ہوں..... ان تمام وجوہات کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچا جائے گا کہ کسی نظامِ حکومت کے لئے قومیت پرستی کی بنیاد بڑی ہی خطرناک ہے۔ (صـ ۱۶۶)

اس سے پیشتر یہی پروفیسر صاحب لکھ چکے ہیں کہ موجودہ دَور کی لڑائیوں کی بنا وہ کشمکش اور جذبۂ رقابت

ومنافست ہے جو مختلف اقوام کے دلوں میں مختلف اقوام کو کچلنے کے لئے پیدا ہوتا ہے[1] (ص ۳۱) - ان مباحث کا اصلی مقام تو حکومتِ خداوندی کا عنوان ہے. لیکن ان اشارات سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ انسان بایں ہمہ دعوائے تمدن وتہذیب ہنوز اسی لعنت میں گرفتار ہے جس میں وہ قبائلی زندگی کے دور میں تھا. یہ ہے وہ روش جس پر انسان نے اپنی تمدنی زندگی کی بنیاد، تنہا اپنے ذہن کی روشنی میں رکھی. اس کے برعکس، اس مسلکِ حیات کو دیکھئے جو وحی کی روشنی میں متعین کیا گیا. حضرت نوحؑ اپنی قوم کے ایک فرد ہیں لیکن جونہی ان کی دعوت کی ابتدا ہوتی ہے قوم دو حصّوں میں بٹ جاتی ہے. ایک وہ جو اس دعوتِ آسمانی پر ایمان لاتا ہے. دوسرا وہ جو اس کی تکذیب ومخالفت کرتا ہے. اس دوسرے طبقے میں صاحبانِ دولت وثروت ہیں، اونچے گھرانے کے افراد ہیں. دوسری طرف مفلس ونادار انسانوں کی جماعت ہے جنہیں اوّل الذکر طبقہ "اراذل" شمار کرتا ہے لیکن یہ جماعتِ مؤمنین (حزب اللہ) اللہ کے قانون کی حفاظت اور رسول کی رحمت وشفقت کے سائے میں بڑھتی ہے. جماعتِ مخالفین خود انہی کی قوم کے افراد ہیں. یقیناً ان کے رشتہ دار بھی ہوں گے. لیکن ان کے ساتھ اب ان کا کوئی تعلق نہیں. ان کے تعلقات کی بنیاد اب ایک اور ہی جذبہ ہے اور وہ جذبہ ایمان کا ہے. حتّٰی کہ حضرت نوحؑ کا بیٹا بھی چونکہ مکذبین کی جماعت میں ہے، اس لئے اس قدر قریبی رشتے کے باوجود ان کے "اہل" میں سے قرار نہیں پاتا. اب "اہل" اور "غیر" کی تقسیم کا معیار کچھ اور قرار پا چکا ہے. اب ان کے "اہل" وہ "غیر" ہیں جن سے اس سے پیشتر قرابت واری کا کوئی تعلق نہ تھا. دعوتِ نوحی سے اس حقیقتِ عظمٰی کی ابتدا ہوئی. اس سے آگے آپ دیکھیں گے کہ ہر رسول کے زمانہ میں اس تقسیم کے مظاہر سامنے آتے جائیں گے. حضرت لوطؑ کی بیوی اس تقسیم کی رُو سے کفّار کی جماعت میں شامل تھی، نبی کے اہل میں سے نہیں تھی. حضرت ابراہیمؑ کے باپ اس تقسیم کی رُو سے "غیروں" میں شامل تھے، اپنوں میں سے نہیں تھے. حضرت موسٰیؑ کی قوم باوجود اشتراکِ وطن، قومِ فرعون سے الگ تھی، لیکن قومِ فرعون میں سے جو لوگ اشتراکِ ایمانی میں حضرت

---

[1] نیشنلزم کے متعلق "ابلیس وآدم" میں وحی کے عنوان میں بھی لکھا جا چکا ہے اور اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ کے تذکارِ جلیلہ میں بھی اس کا ذکر آئے گا. ویسے اگر آپ تفصیلی بحث دیکھنا چاہتے ہیں تو میری کتاب "انسان نے کیا سوچا" ملاحظہ کیجئے.

موسیٰؑ کے ساتھ تھے وہ قومِ موسیٰؑ میں سے قرار دیئے گئے۔ یہ سلسلہ اسی طرح وسیع ہوتا چلا گیا تا آنکہ رسول کافۃً لِلناس کے عہدِ مبارک میں تمام نوعِ انسانی کی تقسیم اسی اصول کے تحت قرار پا گئی۔ قرآنِ کریم نے جہاں "قوم الکافرین" کہا ہے تو اس میں دنیا میں ہر گوشے میں بسنے والے کفار آ گئے۔ جب "قوم الظّٰلمین" اور "قوم الفاسقین" اور "قوم المجرمین" کہا گیا تو تمام صفحۂ ارض کے ظالمین و فاسقین و مجرمین اس جدید "قومیت" کے حلقے میں آ گئے۔ اس کے برعکس، جب ارشاد ہوا کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (۴۹:۱۰) تو اس قومیت کی عالمگیریت و آفاقیت بھی حدود نا آشنا اور قیود فراموش قرار پائی۔ لہٰذا اس اصول کی رُو سے ساری دنیا کے مومن، باوجود اختلافِ رنگ و زبان، وطن، نسب ایک قوم کے فرد اور اس کے برعکس، دنیا بھر کے منکرین، جماعتِ مخالف کے افراد۔ ان دونوں جماعتوں میں دنیا بھر کے اشتراک و وجوہات کے باوجود کوئی اشتراک نہیں تا آنکہ وہ آسمانی وجۂ اشتراک یعنی ایمان کے رشتہ سے اس قومیتِ حقہ کے رُکن نہ بن جائیں کہ

اندریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

یہ ہے وحی کی روشنی میں معیارِ قومیت۔ یورپ تو اس حقیقت کو سمجھ نہیں سکتا کہ اس کے پاس وحی کی قندیلِ آسمانی نہ تھی، لیکن اس شوریدہ بختی کا کیا علاج کہ خود مسلمانوں کا بھی آج یہ عالم ہے کہ یورپ کی تقلید میں اشتراکِ وطن یا نسل کو وجۂ جامعیت قرار دے کر قومیت پرستی کو شعارِ ملی بتایا جا رہا ہے، حالانکہ اب یورپ اس غلط معیارِ تقسیمِ انسانی کے ہاتھوں خود تنگ آ چکا ہے اور اس کے اربابِ فکر و نظر قرآنی تعلیم سے غیر شعوری طور پر متاثر ہو کر یا خود زمانہ کے تقاضوں سے مجبور ہو کر (کہ فطرت کے مطالبات اور زمانہ کے تقاضے بھی انسان کو آہستہ آہستہ قرآن کی طرف آنے کے لئے مجبور کر رہے ہیں) اس حقیقت کو محسوس کر رہے ہیں کہ قومیت کی بنیاد وحدتِ افکار (ایمان و مذہب) پر ہی رکھی جانی چاہیئے نہ کہ جغرافیائی حدود اور رنگ و نسل پر۔ مشہور فرانسیسی مورخ رینان "ESSAY ON NATIONALITY" میں لکھتا ہے کہ

> انسان کی روح دریاؤں کے رُخ اور پہاڑوں کی سمتوں میں مقید نہیں ہو سکتی۔ وطن کی سرزمین انسان کے لئے جائے قیام اور کشمکشِ کاروبار کے لئے ایک میدان مہیا کر دیتی ہے۔ لیکن انسان (اس کے لئے) روح مہیا کرتا ہے۔ اس مقدس تشکیل کے لئے جسے قوم (یا ملت) کہا جاتا ہے، آدمی ہی سب کچھ ہے۔ مادی اسباب میں سے کچھ بھی اس کے لئے کافی

نہیں ہو سکتا۔

اور LORD BRYCE اپنی کتاب (INTERNATIONAL RELATIONS) میں لکھتا ہے کہ

جس چیز پر کسی قوم کی اندرونی اور سب سے گہری زندگی کا انحصار ہے وہ مذہب ہی ہے۔

یورپ کا ایک اور مدبّر (HENRY SIDGWICK) اگرچہ مذہب کو قومیت کی بنیاد قرار نہیں دیتا (اس لئے کہ اس کے سامنے یورپ کی مختلف اقوام موجود ہیں جو ایک مذہب (عیسائیت) کے باوجود الگ الگ قومیت کی مدّعی ہیں) لیکن جس شے کو وہ قومیت کی بنیاد قرار دیتا ہے وہ اسلام میں مذہب کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کے نزدیک مختلف افراد کے ایک قوم بننے کے لئے ضروری ہے کہ ان میں "من تو شدم تو من شدی" کا شعور پیدا ہو جائے۔ یہ شعور کہ وہ ایک "جسدِ واحد" کے مختلف اعضاء ہیں..... اگر ان میں یہ شعور موجود ہو تو ہم انہیں ایک قوم کے افراد قرار دیں گے خواہ ان میں کوئی اور وجۂ جامعیت ہو یا نہ ہو ــــ (ELEMENTS OF POLITICS)۔ اسلام میں یہ شعورِ یگانگت اس وحدتِ فکر و نظر سے پیدا ہوتا ہے جس کا نام ایمان ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآنِ کریم مختلف شعوب و قبائل (اقوام و ملل) کا اعتراف (RECOGNISE) کرتا ہے لیکن صرف تعارفی غرض کے لئے، اس سے زیادہ اور کسی مقصد کے لئے نہیں۔ جیسے کسی شخص کے پانچ سات بیٹے ہوں تو وہ تعارف (پہچان) کی خاطر ان کے الگ الگ نام رکھ لیتا ہے یا جس طرح، محض انتظامی غرض کے لئے کسی مملکت کے مختلف خطّے (صوبے) بنا دیئے جاتے ہیں اور ان کا کچھ تعارفی نام رکھ لیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے، دنیا کے مختلف خطّوں میں بسنے والے ممالک میں تعارفی نشانات کو روا رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ تفریق ایک دوسرے پر فضیلت کا باعث یا قومی عصبیت یا غیریت کا موجب بننے لگے تو یکسر غیر اسلامی ہے اور اس کا مٹانا نہایت ضروری۔ قرآنِ کریم کی رُو سے معیارِ فضیلت فقط تقویٰ ہے اور بس! تمام انسان ایک اصل کی مختلف شاخیں ہونے کے اعتبار سے برابر ہیں۔ اس لئے یہ چیز کہ کوئی شخص کسی آدمی کے گھر میں پیدا ہو گیا ہے یا اس کا وطن کونسا ہے، نہ وجہِ امتیاز بن سکتا ہے نہ باعثِ تفریق۔

قرآنِ کریم نے نہایت واضح الفاظ میں اس حقیقت کو بیان فرمایا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ

لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝ (۴۹/۱۳)

اے نوعِ انسانی! ہم نے تمہیں (سب کو ایک ہی طرح) مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہاری شاخیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ (لیکن یاد رکھو کہ) تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ شعار ہے۔ یقیناً اللہ (سب کچھ) جاننے والا خبردار ہے۔

چونکہ نسل کی بنیاد پر قبائل کی تقسیم میں ایک دوسرے پر برتری اور فضیلت کا امکان زیادہ تھا (کہ اونچی اور نیچی ذاتیں اسی طرح وجود میں آتی ہیں) اس لئے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلی دعوت کے ذکر میں اس حقیقت کی وضاحت کر دی کہ اگر کسی کا اپنا بیٹا بھی، کسی دوسری آئیڈیالوجی (ایمان) کو مانتا ہے تو وہ اور اس کا باپ دونوں ایک جماعت کے رکن، ایک برادری کے فرد اور ایک قوم کے آدمی نہیں بن سکتے۔

عملِ غیر صالح کی ایک اور توجیہہ

اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (۱۱/۴۶) سے بعض حضرات کا ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ کا یہ بیٹا ان کی بیوی کے عملِ بد کا نتیجہ تھا۔ اس لئے کہ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ ہے:۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَتَ لُوْطٍ ۭ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّ قِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ۝ (۶۶/۱۰)

ان لوگوں کے لئے جو (حق و صداقت کی دعوت کا) انکار کرتے ہیں، اللہ نوح اور لوط کی بیویوں کی مثال بیان کرتا ہے۔ وہ ہمارے بندوں میں سے دو صالح بندوں کے زیر تھیں لیکن انہوں نے ان کی خیانت کی تو وہ اللہ کے (فیصلہ کے) مقابلہ میں دونوں ان کے کسی کام نہ آسکے (وہ تباہ ہو کر رہیں اور رسول کی بیوی ہونے کی حیثیت ان کے کسی کام نہ آسکی) اور (ان سے) کہا گیا کہ تم دونوں جہنم میں داخل ہونے والوں کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔

لیکن حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں کی اس "خیانت" سے خیانتِ عصمت مراد لینا دُور افتادہ سی بات ہے۔ چنانچہ خود اس آیت سے متصل آیت۔

وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَ نَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَ عَمَلِهٖ وَ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۙ (۶۶/۱۱)

اور ایمان والوں کے لئے اللہ فرعون کی بیوی کی مثال بیان کرتا ہے۔ جب اس نے عرض کیا اے میرے ربّ! میرے لئے اپنے پاس جنّت میں گھر بنا اور مجھے فرعون اور اس کے اعمال سے نجات دے اور مجھے ظالمین کی قوم سے بچائے رکھ۔

ان آیات میں حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں کا تقابل، فرعون کی بیوی سے کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہ تقابل یہاں کفر و ایمان کا تقابل ہے، عصمت و بے عصمتی کا نہیں۔ پھر حضرت نوحؑ اور ان کے بیٹے کا معاملہ کفر و ایمان سے متعلق تھا۔ اگر ان لوگوں کا خیال صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اگر حضرت نوحؑ کا بیٹا "انہی کا بیٹا ہوتا" تو اسے عذابِ خداوندی سے نجات مل جاتی، خواہ وہ دعوتِ نوحی کا منکر ہی کیوں نہ ہوتا۔ یہ قرآنی تعلیم کے صریحاً خلاف ہے۔ یہاں تو بتانا ہی یہ مقصود تھا کہ خواہ بیٹا ہی کیوں نہ ہو اگر جماعتِ مخالف (منکرین) میں شامل ہے تو نسبی تعلق اسے کچھ فائدہ نہیں دے سکتا، جس طرح حضرت ابراہیمؑ کے باپ کو نسبی رشتہ کچھ فائدہ نہ دے سکا۔ اور حضور خاتم النبیینؐ کے عہدِ ہمایوں میں بدر و حنین کے میدانوں نے دیکھ لیا کہ کس طرح نسبی تعلقات، ایمانی رشتہ پر قربان کئے جاتے ہیں۔

ان تصریحات سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حضرت نوحؑ (کے بیٹے کی طرح ان) کی بیوی بھی ایمان نہیں لائی تھی اور اس کا حشر بھی وہی ہوا تھا جو دوسرے کفار کا ہوا۔ نہ حضرت نوحؑ کا باپ ہونا ان کے بیٹے کے کام آیا، نہ ان کا خاوند ہونا ان کی بیوی کے کسی کام۔ دین میں باہمی تعلق کی بنیاد ایمان ہے نہ کہ رشتہ داریاں۔

عذابِ الٰہی اور مادّی اسباب

انکارِ رشد و ہدایت کے سلسلہ میں دوسرا اہم گوشہ عذابِ الٰہی کا فلسفہ ہے۔ اس کی تفصیلی بحث کا تو یہ مقام نہیں لیکن یہاں اجمالی اشارات ضروری سمجھے گئے ہیں کیونکہ دعوتِ آسمانی کے سلسلے میں شروع سے اخیر تک یہ ٹکڑا مشترک ہے۔ قومِ نوحؑ کی غرقابی کے واقعہ پر سرسری مؤرخانہ نگاہ صرف اتنا بتا سکے گی کہ پانی کا بلا انگیز

طوفان آیا اور (سوائے ان لوگوں کے جو ایک کشتی میں سوار تھے) سب غرق ہو گئے۔ ان کی بستیاں نذرِ سیلاب ہو گئیں۔ سارے علاقہ میں کوئی متنفس باقی نہ رہا۔ جہاں اس شدت کا سیلاب آتا ہے وہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض محققین نے اس امر کی تحقیق کی بھی کوشش کی ہے کہ اس طوفان (DELUGE) کا طبیعی سبب کیا تھا۔ مثلاً 'SUSS' کا خیال ہے کہ "خلیج فارس کا ساحل کسی عظیم الشان آتش فشاں لہر سے ٹکرایا اور اس کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا طوفانِ بادِ تند (CYCLONE) شامل ہو گیا۔

(ENCYCLOPAEDIA OF RELIGIONS AND ETHICS)

لیکن ہم نے دیکھنا یہ ہے کہ قرآنِ کریم ان واقعات کا ذکر کس انداز سے اور کس مقصد کے لئے کرتا ہے قومِ نوحؑ کے سلسلہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان کی تباہی سیلاب سے ہوئی۔ اس کے بعد قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ لوط وغیرہ کے ضمن میں ہم دیکھیں گے کہ ان کی تباہی زلزلہ کے جھٹکوں، کوہِ آتش فشاں کی شرر باریوں اور آندھی کے جھکڑوں وغیرہ سے ہوئی یعنی خارجی کائنات کے طبیعی حوادث ان کی تباہی کا موجب بنے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ حوادث ان کی بداعمالیوں کا نتیجہ تھے یا انہیں ان کی تباہی کا موجب بنا دیا گیا تھا؟ اس کے لئے سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ آج بھی زلزلے آتے ہیں، آتش فشاں پہاڑ پھٹتے ہیں۔ سیلاب بڑے بڑے ملکوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ آندھیوں کے طوفان چلتی ہوئی ریل گاڑیوں کو الٹا کر دریاؤں میں پھینک دیتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ حوادث کسی قوم کی بدعملیوں کا نتیجہ نہیں ہوتے اس لئے کہ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کسی خاص خطۂ زمین کے انسانوں نے اخلاقی بدعملیاں شروع کیں اور ان پر اس قسم کا طبیعی حادثہ وارد ہو گیا۔ یا یہ کہ اس قسم کے حوادث میں صرف بدعمل لوگ ہی تباہ ہوتے ہوں، نیک اعمال والے اس سے محفوظ رہتے ہوں۔ یہ طبیعی حوادث دنیا کے ہر خطے میں آتے رہتے ہیں اور ان میں اچھے اور بُرے ہر قسم کے انسان تباہ ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ یہ حوادث نہ تو کسی قوم کے غلط اخلاقی اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں اور نہ ہی ان سے صرف بداعمال لوگ تباہ ہوتے ہیں۔

ابتداءً میرا بھی یہ خیال تھا کہ ان حوادث اور اُن اقوام کے اعمال میں ایک بنیادی ربط تھا۔ لیکن قرآن پر مزید غور و تدبر نے میری راہ نمائی اس طرف کی ہے کہ یہ حوادث ان کے اخلاقی اعمال کا نتیجہ نہیں ہوتے تھے۔ البتہ یہ اُن کی تباہی کا ذریعہ بنا دیئے جاتے تھے۔ ہوتا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے طبیعی حادثہ کا علم، اس رسول کو قبل از وقت مل جاتا تھا اور اس سے کہہ دیا جاتا تھا کہ وہ یا تو اس سے

محفوظ رہنے کی کوئی تدبیر کرے یا اُس سے پہلے اس جگہ سے نکل کر اپنے ساتھیوں سمیت دوسری جگہ چلا جائے۔ چنانچہ ہم نے حضرت نوحؑ کے تذکرہ میں دیکھا ہے کہ انہیں اس آنے والے طوفان کا علم قبل از وقت دے دیا گیا اور کہہ دیا گیا کہ وہ اس سے بچنے کے لئے کشتی بنالیں۔ وہ اپنے مخالفین کے سامنے کشتی بنانے میں مصروف تھے۔ لیکن چونکہ ان مخالفین کا انداز ہی یہ ہو گیا تھا کہ وہ ان کی ہر بات کو غلط بات سمجھتے اور اس کی تکذیب کرتے تھے، اس لئے وہ بجائے اس کے کہ حضرت نوحؑ کی بات کو سچا سمجھ لیتے اُلٹا ان کا مذاق اڑانے لگے۔ چنانچہ سیلاب اپنے وقت پر آیا۔ حضرت نوحؑ اور ان کی جماعت اس کشتی کے ذریعہ اس تباہی سے محفوظ رہ گئے اور باقی قوم غرق ہو گئی۔ لہٰذا ان حوادث کے ذریعے ان اقوام کی تباہی میں اگر کوئی "مافوق الفطرت" عنصر تھا تو اتنا کہ اس رسول کو آنے والے حادثہ کا علم قبل از وقت دے دیا جاتا تھا اور وہ اپنی اور اپنی جماعت کی حفاظت کا مناسب انتظام کر لیتا تھا۔ لیکن نبیٔ اکرمؐ کے زمانہ میں مخالفین کی تباہی کے لئے یہ ذریعہ اختیار نہیں کیا گیا۔ اور چونکہ نبیٔ اکرمؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا اس لئے اب اس قسم کے حوادث کے قبل از وقت علم مل جانے کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ لہٰذا اب قوموں کی تباہی کی یہ صورت اس شکل میں باقی نہیں رہی جس شکل میں یہ اقوامِ سابقہ کے سامنے آیا کرتی تھی۔

قرآن نے قوموں کی موت اور زندگی کے ابدی قوانین دے دیئے ہیں اور یہ بتا دیا ہے کہ جو قوم ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے گی اسے زندگی کی خوشگواریاں نصیب ہو جائیں گی، جو ان کے خلاف جائے گی وہ تباہ اور برباد ہو جائے گی۔ جو قوم اپنے معاشرہ کی عمارت غلط بنیادوں پر استوار کرتی ہے وہ اپنے غلط نظام کی وجہ سے تباہ ہو جاتی ہے۔ اس کی تباہی خود اس غلط معاشرہ کی بنیادوں کے اندر مضمر ہوتی ہے۔ اس کا نام قانونِ مکافاتِ عمل ہے، یعنی قوموں کے اجتماعی اعمال ان کی زندگی اور موت کا باعث بنتے ہیں اور یہ نتائج خدا کے اس قانون کے مطابق مرتب ہوتے ہیں جن میں کوئی ردوبدل نہیں کر سکتا نہ ہی کسی میں یہ قوت ہے کہ وہ ان قوانین کے نتائج کو بدل دے۔ قوموں کے عروج و زوال کے فیصلے اسی غیر متبدل قانون کے مطابق ہوتے ہیں اور اسی کو ان کی "تقدیر" کہا جاتا ہے۔

لہٰذا اقوامِ سابقہ کی تباہی اور اقوامِ حاضرہ کی ہلاکت کے سلسلہ میں اس اہم حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ قرآن اقوامِ سابقہ کا تذکرہ اس لئے کرتا ہے کہ بتایا جائے کہ انہوں نے صحیح نظامِ زندگی کی دعوت کو نہ مانا اور اس دعوت دینے والوں کی مخالفت کی اور وہ تباہ و برباد ہو گئے۔ اصل مقصد ان کی غلط

روشِ زندگی کی طرف توجہ منعطف کرانا ہے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اسے ذرا واضح الفاظ میں یوں سمجھئے کہ:

(۱) دنیا میں طبیعی واقعات (PHYSICAL EVENTS) قوانینِ فطرت کے مطابق واقع ہوتے رہتے ہیں۔ کسی قوم کی بداخلاقی یا حُسنِ اخلاق کا ان پر اثر نہیں پڑتا۔

(۲) طبیعی حوادث (سیلاب، زلزلہ، آندھیاں، جھکڑ، خشک سالی وغیرہ) سے حفاظت (یا ان کی وجہ سے پہنچے ہوئے نقصان کا ازالہ) طبیعی اسباب وذرائع سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس میں بھی (مذہب کی زبان میں) نیک عمل یا بدعملی کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ایسا البتہ ضرور ہوتا ہے کہ جس قوم میں اجتماعی بدکرداری (CORRUPTION) آجائے یا جو قوم (مثلاً) عیش وعشرت میں غرق ہو کر اپنے ملک کے نظم ونسق کی طرف سے غافل ہو جائے تو ان کی اس بدنظمی کی وجہ سے اس قسم کے طبیعی حوادث ان کی تباہی کا موجب بن جاتے ہیں، یعنی یہ حوادث رونما تو ان کی اس طبیعی بدنظمی کی وجہ سے نہیں ہوتے لیکن ان کی بدنظمی کی وجہ سے ان کا نقصان سخت ہوتا ہے جس کی وجہ سے بعض اوقات وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ جو قوم اپنے نظم ونسق کو درست رکھے وہ اس قسم کے نقصانات سے یا بالکل محفوظ رہ سکتی ہے یا ان کا ازالہ بعجلت کر لیتی ہے۔

یہی پہلے ہوتا تھا، یہی اب ہوتا ہے۔ اس "سنت اللہ" میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ (۳۵/۴۳)۔

(۳) اقوامِ سابقہ جب آرام طلبی، سہل انگاری اور عیش سامانی کی زندگی میں جذب ہو جاتی تھیں تو وہ اپنے اجتماعی نظم ونسق کی طرف سے غافل ہو جاتی تھیں۔ خدا کے رسول، محض واعظ نہیں ہوتے تھے۔ وہ قوموں کو ان کی اس قسم کی بدعملیوں سے بھی آگاہ کرتے تھے لیکن قوم ان کی ایک نہیں سنتی تھی اور رفتہ رفتہ حالت یہ ہو جاتی تھی کہ وہ ان کی ہر بات کا مذاق اڑاتی تھی۔

(۴) حضرات انبیائے کرامؑ یا تو اپنی نگہ دور رس سے یا خدا کی طرف سے وحی کی بنا پر کسی آنے والے طبیعی حادثہ کو ذرا پہلے بھانپ (یا معلوم) کر لیتے تھے۔ وہ قوم کو اس سے آگاہ کرتے اور کہتے کہ وہ اپنی حفاظت کا سامان کر لیں۔ لیکن وہ اپنی خوئے سرکشی اور ہٹ کی بنا پر کان نہ دھرتے۔ نتیجہ یہ کہ حضرات انبیاء کرامؑ اپنے اور اپنی جماعت کے بچاؤ کا انتظام کر لیتے اور باقی ماندہ (سرکش) قوم اس حادثہ کی وجہ سے تباہ ہو جاتی۔

یہی کچھ اُس زمانے میں ہوتا تھا، یہی کچھ آج ہوگا۔ آج، ان اقوام کو متنبہ کرنے والے "رسول" نہیں ہوں گے، انہی کے دیدہ ور ہوں گے۔ جو ان کی مان لے گا، تباہی سے بچ جائے گا۔ جو نہ مانے گا تباہ ہو جائے گا اور یہ تباہی

اجتماعی ہوگی. جس قوم کے انجنیئر بند کی تعمیر کے وقت سیمنٹ کی جگہ ریت استعمال کریں گے وہ قوم سیلاب کی نذر ہو جائے گی. قوم کا جرم یہ تھا کہ اس نے ایسا انتظام کیوں نہ کیا کہ سیمنٹ کی جگہ ریت کا استعمال نہ ہو۔

حضرت نوحؑ نے دعا کی تھی کہ

وَ قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ (۷۱/۲۶)

اور نوح نے دعا کی، اے اللہ ان نہ ماننے والوں میں سے ایک کو بھی زمین پر باقی نہ چھوڑیو۔

کیا طوفانِ نوحؑ عالمگیر تھا؟

بعض لوگ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ طوفان عالمگیر تھا اور تمام صفحۂ ارض اس کی لپیٹ میں آگیا تھا اور روئے زمین پر کوئی ذی روح باقی نہیں رہا تھا سوائے حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کے جو کشتی میں سوار تھے. یہ خیال صحیح نہیں اور دانستہ یا غیر شعوری طور پر تورات سے مستعار لیا گیا ہے. تورات (کتاب پیدائش) میں لکھا ہے کہ خداوند خدا نے کہا کہ میں چالیس دن اور رات متواتر مینہ برساؤں گا اور ہر اس ذی روح کو جسے میں نے پیدا کیا ہے روئے زمین سے فنا کر دوں گا۔ (پیدائش ۷/۴) چنانچہ چالیس شب و روز کی بارش کے بعد (۷/۱۲) ایک سو پچاس دن تک طوفان کا پانی موجیں مارتا رہا (۷/۲۴) اور ساتویں مہینے سفینۂ نوح ارارط کی پہاڑیوں پر جا کر رُکا اور دسویں مہینے میں جا کر پہاڑ کی چوٹیاں دکھائی دیں. (پیدائش ۸/۴-۵) اور جب زمین نئے سرے سے خشک ہوئی تو جو جاندار کشتیٔ نوح میں تھے اُن کے علاوہ اور کہیں کوئی متنفس باقی نہ تھا (پیدائش ۷/۲۴-۲۱). لیکن قرآنِ کریم نے کہیں ایسا نہیں کہا. برعکس اس کے یہ ظاہر ہے کہ حضرت نوحؑ کا تخاطب اپنی قوم سے تھا. ان کی دعوت انہی کے لئے تھی اور اس دعوت کی تکذیب بھی انہی کی طرف سے ہوئی. لہٰذا یہ تباہی بھی انہی پر وارد ہوئی. باقی دنیا کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا. طوفانِ نوحؑ کی آماجگاہ وہی وادی تھی جہاں یہ قوم آباد تھی. باقی رہا یہ کہ حضرت نوحؑ نے اپنی دعا میں یہ کہا تھا کہ

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ (۷۱/۲۶)

اے میرے رب ان نہ ماننے والوں میں سے کسی کو بھی ارض پر باقی نہ چھوڑ.

تو اس میں (اَلْاَرْض) سے مراد تمام صفحۂ ارض نہیں بلکہ وہ ملک ہے جس میں وہ قوم بستی تھی. قرآنِ کریم میں متعدد شواہد موجود ہیں جن میں 'اَلْاَرْض' سے مراد ایک خاص علاقہ ہے. مثلاً قصۂ حضرت موسیٰؑ

میں فرمایا ہے کہ۔

وَ اِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِی الْاَرْضِ ۚ (۱۰/۸۳)

اور اس میں شک نہیں کہ فرعون ملک (مصر) میں بڑا ہی سرکش بادشاہ تھا۔

یہاں الارض ملکِ مصر کے لئے آیا ہے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ فرعون کی سرکشی اور تمرّد اور غلبہ و تسلط تمام روئے زمین پر نہیں تھا، بلکہ ایک خاص ملک کے اندر محدود تھا۔ اسی طرح حضرت داؤدؑ کے متعلق فرمایا۔

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ..... (۳۸/۲۶)۔

اے داؤد! ہم نے تجھے ملک (ارض) میں حاکم بنایا ہے۔ سو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو۔

یہاں بھی ظاہر ہے کہ حضرت داؤدؑ کی سلطنت تمام صفحۂ ارض پر نہیں تھی، بلکہ ایک خاص خطۂ ملک میں تھی۔ لہٰذا اُن مقامات میں الارض سے مراد تمام روئے زمین نہیں، بلکہ وہ خاص علاقہ ہے جس سے واقعۂ زیرِ نظر کا تعلق ہے۔ یہی مفہوم قصۂ حضرت نوحؑ میں "الارض" سے ہے۔

حضرت نوحؑ کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِیْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا ؕ (۲۹/۱۴)

اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ ان میں پچاس برس کم ہزار سال رہا۔

عمرِ نوحؑ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت نوحؑ کی عمر ساڑھے نو سو سال کی تھی؟ اگر تورات کی جائیے تو حضرت نوحؑ آدم سے دسویں پشت میں آتے ہیں اور ان تمام کی عمریں آٹھ آٹھ نو نو سو سال کی لکھی ہیں۔ چین کے مذہب TAOISM کا ایک بہت بڑا مبلغ KWANG چوتھی صدی قبل مسیح میں گذرا ہے۔ یہ وہ بتانے کے بعد کہ عمر بڑھانے کا کیا طریقہ ہے، لکھتا ہے کہ

میں بارہ سو سال سے اسی طریق کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہوں اور اس پر بھی میرا جسم رُو بہ انحطاط نہیں ہوا۔

لیکن قدیم زمانہ کی تاریخ میں بادشاہوں کی عمریں عام طور پر بہت لمبی لمبی لکھی گئی ہیں۔ اب ان روایات سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں کسی مورثِ اعلیٰ کی عمر سے مقصود یہ ہوتا تھا کہ اس کے خاندان میں حکومت کتنے عرصہ تک رہی۔ یہ عرصۂ حکومت اس مورثِ اعلیٰ کی عمر لکھا جاتا تھا، یعنی خاندان کے بجائے خاندان کے مورثِ اعلیٰ کا نام ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔ اس اعتبار سے قیاس یہی ہے کہ حضرت نوحؑ کی عمر سے مراد وہ زمانہ ہے جس میں ان کی تعلیم جاری رہی۔ زیرِ نظر آیت میں ہے۔

فَلَبِثَ فِيهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا (۲۹/۱۴)

اس میں ایک ہزار کے ساتھ سَنَةٍ کا لفظ آیا ہے اور خَمْسِيْنَ کے ساتھ عَامًا کا۔ سَنَةٍ اور عَامًا دونوں کے معنی سال ہیں اس فرق کے ساتھ کہ سَنَةٍ بالعموم اس سال کو کہتے ہیں جس میں سختیاں آئیں اور عامًا خوشحالی کے سال کو کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے اس آیت کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی تعلیم پہلے پچاس سال تو نہایت عمدگی سے جاری رہی لیکن اس کے بعد ان کے متبعین پر سختیوں کا دور شروع ہو گیا۔

اس ساڑھے نو سو برس کی مدت کو حضرت نوحؑ کے زمانۂ شریعت پر اس لئے بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مندرجہ صدر آیت کے بعد ہی حضرت ابراہیمؑ کا ذکر شروع ہو جاتا ہے اور تورات کی رُو سے حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں نو سو باون (۹۵۲) سال کا فرق ہے۔ اگرچہ خود تورات اور تاریخ کے دیگر شواہد کی روشنی میں دیکھا جائے، تو حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ قریب اڑھائی ہزار سال قبل مسیح کے لگ بھگ متعین ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور چیز بھی غور طلب ہے۔ عربی لغت میں سَنَةٌ کا اطلاق فصل پر بھی ہوتا ہے جو سال میں چار ہوتی ہیں، یعنی چار فصلوں کا ایک سال ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے اَلْفَ سَنَةٍ کے معنی ہوں گے اڑھائی سو سال۔ اور عَامٌ پورے سال کو کہتے ہیں، اس لئے اگر خَمْسِيْنَ عَامًا (پچاس سال) کو اس میں سے منہا کر دیا جائے تو باقی دو سو سال رہ جاتے ہیں اور اتنی عمر کچھ ایسی مستبعد نہیں۔

بہرحال یہ ہنوز تاریخ کے قیاسات ہیں اور چونکہ قرآن نے ان حضرات کے زمانہ کے متعلق بحث نہیں کی، اس لئے ان قیاسات میں سے جو بھی حقیقت کے قریب ہوں (یا بعد کے انکشافات انہیں ایسا

ثابت کردیں) انہیں درست سمجھا جائے گا۔

یہ ہے قومِ نوحؑ کی داستانِ عبرت انگیز جسے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ پر وحی فرمایا:۔

تِلْكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ ۖ مَا كُنتَ تَعْلَمُهَا أَنتَ وَلَا قَوْمُكَ مِن قَبْلِ هَٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۖ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ ۝ (۱۱/۴۹)

(اے پیغمبرؐ!) یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جسے ہم وحی کے ذریعے تجھے بتلا رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تو یہ باتیں تو جانتا تھا اور نہ تیری قوم۔ پس تو ان تاریخی شواہد کی روشنی میں اپنے منصب پر استقامت سے جمارہ انجامِ کار متقیوں ہی کے لئے ہے۔

عیسائی معترضین اکثر کہا کرتے ہیں کہ حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کے قصے نبیٔ اکرمؐ کے زمانہ میں عام طور پر مشہور تھے اور یہود اور عیسائی علماء اکثر ان کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔ اس لئے حضورؐ اور اہلِ عرب اُن سے واقف تھے۔ پھر یہ کہنا کس طرح درست ہے کہ یہ وہ امورِ غیب ہیں جن سے نہ نبیٔ اکرمؐ آگاہ تھے نہ ان کی قوم۔ اس میں شُبہ نہیں کہ اس زمانے کے لوگ ان قصص کی عمومی حیثیت سے متعارف تھے لیکن جو تفاصیل قرآنِ کریم نے بیان فرمائی ہیں، نہ صرف یہ کہ وہ زبان زدِ خلائق ہی نہ تھیں بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں کے لٹریچر میں بھی موجود نہ تھیں۔ قصۂ قومِ نوحؑ کا ماخذ تورات ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن ذرا تورات کے بیان کردہ قصے اور قرآنِ کریم

تورات کی تفاصیل

کا مقابلہ کر کے دیکھئے، حقیقت واضح طور پر سامنے آجائے گی کہ (اس) تورات میں ذہنِ انسانی کی فسانہ طرازی کا کس قدر دخل ہے اور قرآنِ کریم کے بیان میں کس قدر صداقت و پاکیزگی ہے۔ قصصِ قرآن کا ایک خاص اسلوب یہ ہے کہ ان سے مؤرخانہ وقائع نگاری مقصود نہیں ہوتی، بلکہ قصہ کی صرف وہی کڑیاں بیان کی جاتی ہیں جن سے کوئی نہ کوئی اہم نتیجہ اخذ کیا جانا مطلوب ہو۔ قصۂ قومِ نوحؑ میں اہم نکات یہ ہیں کہ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو خدائے واحد کی اطاعت کی دعوت دی۔ قوم کے سرکش اور متمرّد طبقہ نے اس دعوت کی تکذیب و مخالفت کی اور جب پانی سر سے گذر گیا تو وہ قوم طوفان کے ذریعے ہلاک ہو گئی۔ اب دیکھئے کہ بائبل طوفان کی وجہ کیا بیان کرتی ہے۔ تورات کی کتابِ پیدائش میں ہے۔

"اور خداوند خدا نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی بدی بہت بڑھ گئی اور اس کے دل کے تصور اور خیال

روز بروز صرف بدی ہوتے ہیں ۝ تب خداوند زمین پر انسان پیدا کرنے سے پچھتایا اور نہایت دل گیر ہوا ۝ اور خداوند نے کہا کہ میں انسان کو جسے میں نے پیدا کیا زمین پر سے مٹا ڈالوں گا ۔ انسان کو اور حیوان کو بھی اور کیڑے مکوڑے اور آسمان کے پرندوں تک کیونکہ میں ان کے بنانے سے پچھتاتا ہوں ۝ مگر نوح پر خداوند نے مہربانی سے نظر کی۔" (پیدائش ۵ ـ ۶/۸)

ذرا غور فرمائیے۔ تورات کا بیان یہ ہے کہ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) خالقِ ارض وسمٰوٰت نے بنانے کو تو یہ مخلوق بنا دی لیکن بنانے کے بعد اس پر سخت پشیمان اور متاسّف ہوا اس لئے اس نے فیصلہ کر دیا کہ میں اپنی مخلوق کو صفحۂ ارض سے نابود کر دوں گا۔ یہ تھا وہ "مقصدِ عظیم" جس کے لئے طوفانِ نوحؑ برپا کیا گیا۔

(۲) کتابِ پیدائش کے مذکورہ صدر بیان، نیز اس کے دیگر بیانات سے ظاہر ہے کہ تورات کی رُو سے طوفانِ نوحؑ عالمگیر حیثیت رکھتا تھا کیونکہ خدا نے یہ کہا تھا کہ صفحۂ ارض پر جس قدر ذی روح موجود ہیں وہ ان سب کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔ اس طوفان کی عالمگیریت کا نظریہ تاریخی تحقیقات کے سامنے نہیں ٹھہر سکا۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجنز اینڈ ایتھکس کا مضمون نگار عنوان "طوفان" (DELUGE) کے تحت لکھتا ہے کہ

ایک عالمگیر طوفان کا عقیدہ اربابِ تحقیق و خبر کے نزدیک بالکل مرفوع القلم ہے۔

اس کے برعکس (جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں) قرآنِ کریم کی رُو سے یہ طوفان صرف قومِ نوحؑ کے علاقے میں آیا تھا نہ کہ ساری دنیا پر اور یہ وہ حقیقت ہے جس کی تائید تاریخی شواہد اور اثری انکشافات سے ہوتی جا رہی ہے۔

(۳) تیسرا اہم نکتہ پسرِ حضرت نوحؑ کا واقعہ ہے جس کے متعلق قرآنِ کریم میں بتایا گیا ہے کہ اُس کے غیر صالح اعمال اُسے کس طرح لے ڈوبے اور نبی کا نسبی تعلق بھی اسے مکافاتِ عمل سے نہ بچا سکا اور وہ "اپنا" ہوتے ہوئے کیسے غیر بن گیا۔ لیکن اب دیکھئے کہ بائبل میں پسرِ نوحؑ کا واقعہ کن الفاظ میں مذکور ہے۔ کتابِ پیدائش کے نویں باب میں ہے:۔

اور نوح کھیتی باڑی کرنے لگا اور اس نے ایک انگور کا باغ لگایا ۝ اور اس کی مے پی کر نشے میں آیا اور اپنے ڈیرے کے اندر آپ کو ننگا کیا۔ اور کنعان کے باپ حام نے اپنے باپ کو ننگا دیکھا اور اپنے دو بھائیوں کو جو باہر تھے خبر دی ۝ تب سِم اور یافت نے ایک کپڑا لیا اور اپنے دونوں کاندھوں پر دھرا اور پچھلے پاؤں جا کے اپنے باپ کی برہنگی کو چھپایا۔ پر ان کی بیٹھ اس کی طرف تھی کہ انہوں نے اپنے باپ کی برہنگی کو نہ دیکھا ۝ جب نوح اپنے نشے سے ہوش میں آیا تو جو اس کے چھوٹے

بیٹے نے اس کے ساتھ کیا تھا معلوم کیا ۲۵ تب وہ بولا کہ کنعان ملعون ہو۔ وہ اپنے بھائیوں کے غلاموں کا غلام ہوگا ۲۶ پھر بولا خداوند سامؔ کا خدا مبارک اور کنعان اس کا غلام ہو ۲۷ خدا یافتؔ کو پھیلائے اور وہ سامؔ کے ڈیروں میں رہے اور کنعان اس کا غلام ہو۔ (کتاب پیدائش ۲۰۔۹/۲۷)

یہاں تین چیزیں قابلِ غور ہیں۔ اوّل حامؔ کا قصور یہ بتایا گیا ہے کہ اس نے اپنے باپ کا ستر دیکھ لیا، لیکن اُس کی سزا کا کچھ ذکر نہیں۔ دوسرے یہ کہ قصور حامؔ کا ہے لیکن لعنت اور پھٹکار کا سزاوار اس کا بیٹا قرار دیا جاتا ہے۔ اور تیسری (اور سب سے اہم) شق یہ کہ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) خدا کے ایک برگزیدہ رسول کو ایک ایسی ہیئت میں پیش کیا گیا ہے جس سے سعید فطرت کا تصور بھی کانپ اُٹھے۔ اس کے برعکس قرآنِ کریم نے حضرت نوحؑ کی جس مقدس سیرت کو پیش کیا ہے اس سے ان کی رفعتِ مرتبت اور علوِ مدارج درخشندہ و تابناک صورت میں آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ حضرت نوحؑ خدا کے برگزیدہ بندے تھے۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۙ (۳/۳۳)

بلاشبہ (یہ واقعہ ہے کہ) اللہ نے آدم اور نوح کو اور ابراہیم اور عمران کے گھرانوں کو تمام دنیا میں برگزیدگی عطا فرمائی۔

وہ عبدِ شاکر تھے۔

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ۝ (۱۷/۳)

تم ان لوگوں کی نسل ہو جنہیں ہم نے (طوفان کی ہلاکت سے نجات دی تھی اور) نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کرایا تھا اور وہ ہمارا ایسا بندہ تھا جس کی سعی و عمل حسنِ نتائج سے بھرپور ہوئے تھے۔

خدا کے مؤمنین کی جماعت میں سے تھے۔

وَ لَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ۝ ..... اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (۳۷/۸۱۔۷۵)

اور یقیناً نوحؑ نے ہمیں پکارا۔ سو ہم کیسے اچھے پکار کا جواب دینے والے ہیں اور ہم نے اسے اور اس کے پیروؤں کو کربِ عظیم سے نجات دی۔

اور اس کی نسل کو ہی باقی رہنے والوں میں رکھا اور آنے والوں میں اس کا (نیک) نام باقی رکھا۔ نوح پر اقوامِ عالم میں سلام ہو۔ اس طرح ہم مخلص بندوں کو جزا دیا کرتے ہیں۔ وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔

وہ حضرت ابراہیمؑ کی طرح خدا کے رسول تھے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّ اِبْرٰهِیْمَ وَ جَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَ الْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَ كَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ (۵۷/۲۶)

اور ہم نے نوح اور ابراہیم کو رسول بنا کر بھیجا اور ان کی نسل میں نبوت اور کتاب کو جاری رکھا۔ سو ان (کی ذریت) میں سے ہدایت پر بھی ہیں اور اکثر ان میں سے فاسق ہیں۔

خدا نے ان کی پکار کو سنا اور اسے شرفِ قبولیت سے نوازا۔

وَ نُوْحًا اِذْ نَادٰی مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّیْنٰهُ وَ اَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِیْمِ ۝ۚ (۲۱/۷۶) ; (۳۷/۷۶)

اور (اسی طرح) نوح کا معاملہ (بھی یاد کرو) جو ان (نبیوں) سے پیشتر کا ہے، جب اس نے ہمیں پکارا تھا (تو دیکھو) ہم نے اس کی پکار سن لی اور اسے اور اس کے گھرانے کو ایک بڑی ہی سختی سے نجات دیدی۔

اور یہ اس لئے کہ آپ احکاماتِ الٰہیہ کے سچے فرمانبردار، پیکرِ تسلیم و رضا اور مظہرِ اطاعت و انقیاد تھے۔ (۷۱-۳)

مُسْلِم آیت (۱۰/۷۲) میں مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ کے ٹکڑے پر غور کیجئے۔ اس چھوٹے سے نگینے کے اندر بڑے بڑے حقائق جھلکتے نظر آئیں گے۔ سب سے پہلے یہ کہ مقامِ نبوت وہ مقام ہوتا ہے جہاں خدا کے قوانین و احکام کی کامل اطاعت ہوتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جس میں صحیح اختیار کی پوری شان جلوہ ریز ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ قرآنِ کریم نے جس سب سے پہلے رسول کا ذکر کیا ہے اس کا نام بھی مسلم قرار دیا ہے۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اس سلسلۂ زریں میں ہر مقام پر اللہ کے برگزیدہ انسان اسی گرامی مرتبت خطاب سے پکارے جائیں گے کہ اسی میں تکمیلِ شرفِ انسانیت کا راز ہے اور اس کے بعد یہ کہ جو پیغام حضرت نوحؑ سے شروع ہوا وہ بھی اسلام ہی تھا اور جس کی تکمیل حضور ختمی مرتبتؐ کے عہدِ ہمایوں میں ہوئی وہ بھی اسلام ہی تھا۔ گویا سلسلۂ رسالت و نبوت کی داستانِ قدسی اسلام اور اُمتِ مسلمہ ہی کی داستان ہے۔

لہٰذا، تورات کے بیان اور قرآن کے بیان میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔ بنابریں یہ کہنا کہ قرآن میں مذکور واقعہ تورات سے اخذ کیا گیا ہے، جہالت پر مبنی ہے۔

یہ ہے تذکرہ حضرت نوحؑ کا جن کی ذریت میں تمام انبیائے امم سامیہ آئے جن کا ذکرِ جلیل آئندہ اوراق کے لئے وجہِ زینت و مایۂ افتخار ہوگا۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ مِنْ ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ (۱۹/۵۸)

یہ انبیاء میں سے وہ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا آدم کی نسل سے اور ان سے جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا۔

یہی بنی اسرائیل کے مورثِ اعلیٰ تھے۔

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا (۱۷/۳)

تم (اے بنی اسرائیل) ان لوگوں کی نسل ہو جنہیں ہم نے (طوفان کی ہلاکت سے نجات دی تھی اور) نوح کے ساتھ (کشتی میں) سوار کرایا تھا۔ وہ ایک عبدِ شکور تھا۔

انہی کی نسل آگے بڑھ کر مختلف ندیوں اور دریاؤں کی صورت میں صفحۂ ارض پر پھیلی۔

وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِينَ (۳۷/۷۷)

اور ہم نے اسی نسل کو باقی رہنے والوں میں سے بنایا۔

تاریخ کے پارینہ اور منتشر اوراق اور اثری انکشافات کے منقوش خط و خال آہستہ آہستہ اسی مؤسسِ اولیٰ کی طرف لئے جا رہے ہیں۔ معلوم نہیں جب یہ تحقیقات اپنی تکمیل تک پہنچیں گی تو اس عہدِ کہن کے متعلق کیا کیا امور منصۂ شہود پر آئیں گے۔ سرِدست، اربابِ نظر کے لئے یہ حقیقت بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی کہ طوفان (DELUGE) کی داستانیں دنیا کے قریب قریب تمام اقوام کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ بابل کے کھنڈرات میں آج سے قریب چار ہزار سال پیشتر کی ایک نظم ملی ہے جو ایک عظیم الشان طوفان کا ذکر کرتی ہے۔ یونان، ایران ہندوستان، چین حتیٰ کہ امریکہ کے باشندوں کے ہاں، اساطیر الاولین میں طوفان کا تذکرہ موجود ہے۔ ہندوؤں کی پرانی کتابوں میں یہ قصہ بڑے دلچسپ انداز میں مذکور ہے۔ ست پت برہمن میں ہے کہ ایک دن منوجی

کے لئے غسل کا پانی لایا گیا، تو اس میں سے ایک مچھلی ان کے ہاتھ میں آ گئی۔ مچھلی نے کہا کہ اگر آپ آزادانہ طور پر میری پرورش کریں تو میں آپ کو ایک طوفانِ عظیم سے نجات دلادوں گی۔ منّو جی نے اس کی خواہش کے مطابق اسے آزاد کر کے سمندر تک پہنچا دیا اور اس کی ہدایت کے بموجب ایک کشتی بنائی۔ جب طوفان آیا تو سمندر سے وہی مچھلی برآمد ہوئی اور منّو جی نے اپنا جہاز اس کے سینگوں سے باندھ دیا جو اسے شمالی پہاڑوں کی چوٹی پر لے گئی۔ بھگوت پران میں ہے کہ ایک دفعہ جب برہما (یعنی خدا) سو رہے تھے تو ایک دیو ویدوں کو چُرا کر لے گیا۔ ہری جی نے مچھلی کا بھیس بدل کر یہ راز ستیہ ورت کو بتا دیا جو پانیوں کا بادشاہ تھا۔ ہری جی اور اس دیو کی لڑائی ہوئی۔ اس میں ہری جی نے ایک عظیم الشان طوفانِ بلا انگیز برپا کر کے اس دیو کو شکست دی۔

اسی طرح باقی اقوام و ملل میں بھی طوفان کے قصّے افسانوں کے رنگ میں باقی رہ گئے ہیں۔ کیا معلوم آنے والے انکشافات، ان مختلف ممالک و متنوّع مقامات کے اندر پھیلے ہوئے قصّوں کی قدرِ مشترک کے متعلق کیا کچھ ظاہر کریں۔ بہرحال قرآنِ کریم میں جس طوفان کا قصّہ مذکور ہے اُسے ہم اوپر دیکھ چکے ہیں وہ ایک "پرانا قصّہ" نہیں، اقوام و ملل کی حیات و موت کی زندہ کہانی ہے جس کے آئینے میں تقدیرِ اُمم کے خطوط اُبھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

ہم نے شروع میں لکھا ہے کہ قرآن میں سلسلۂ انبیاء کرامؑ کے تذکرہ کا آغاز حضرت نوحؑ کے قصّہ سے ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر حضرت آدم کو سب سے پہلا نبی تصوّر کیا جاتا ہے اور اس سے مراد لئے جاتے ہیں وہ "آدم" جو جنّت سے نکلے تھے۔ "جنّت سے نکلنے والے آدم" کے متعلق ہم "ابلیس و آدم" میں تفصیل سے بتا چکے ہیں کہ وہ کسی خاص فرد کا ذکر نہیں بلکہ خود نوعِ انسانی کا ذکر ہے۔ وہ کسی خاص فرد "آدم" کی کہانی نہیں، خود "آدمی" کی سرگذشت ہے۔ قرآن میں آدمی کے بجائے آدم کا لفظ آیا ہے۔ اس لئے "جنّت سے نکلنے والے آدم" سب سے پہلے نبی نہیں ہیں۔ البتہ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ وَ نُوْحًا..... (۳/۳۲)

اس میں آدم کا لفظ نوح کے ساتھ آیا ہے اور ان کے لئے لفظ اِصْطَفٰی آیا ہے۔ اگرچہ اس لفظ سے بالضرور نبوّت ہی مراد نہیں ـــــ قرآن میں یہ لفظ غیر از نبی کے لئے بھی آیا ہے ـــــ لیکن اگر اس سے نبوّت ہی مراد لے لی جائے، تو اس آیت (۳/۳۲) سے زیادہ سے زیادہ یہ مترشح ہوگا کہ حضرت نوحؑ سے پہلے جو انبیاء گذرے تھے یا جو ان کے ہم عصر تھے، ان میں سے کسی کا نام آدم بھی ہوگا۔ (انگریزی زبان میں اب بھی لوگوں کے نام ADAM

ہوتے ہیں۔ یہ آدم بہرحال "جنت سے نکلنے والے آدم" نہیں تھے۔ (جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے) وہ آدم کوئی ایک فرد نہیں تھا۔ ویسے بھی قصۂ آدم میں جس معصیت کا ذکر ہے (یعنی خدا کے حکم سے دیدہ دانستہ سرکشی) وہ کسی نبی کے شایانِ شان نہیں ہو سکتی۔ اس کے مرتکب عام آدمی ہی ہو سکتے ہیں۔

خلاصۂ مبحث انسانی آبادی کی ابتدا کس خطۂ زمین اور کونسی نسل سے ہوئی، یہ مسئلہ ایک مدت سے اربابِ علم و تحقیق کے پیشِ نظر ہے۔ لیکن اب فیصلہ کا رُخ اسی طرف ہے کہ اس کی ابتدا عرب کے علاقہ سے ہوئی جہاں کی سامی نسل آنے والی تہذیب و تمدن کی موسّس تھی۔ اسی قوم میں دجلہ و فرات کی وادیوں میں آج سے قریب چھ سات ہزار سال پیشتر حضرت نوحؑ مبعوث ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اس قوم میں طبقات کی تقسیم اور پیشوں کے اعتبار سے تفریق و تمیز شروع ہو چکی تھی۔ اربابِ اقتدار و ثروت نے اس دعوتِ انقلاب کی مخالفت کی جو حکومت و اختیار اور رزق کے سرچشموں کو ان سے چھین کر خدا کے قانون کے سپرد کر دینے کا مدّعی تھا۔ نچلے طبقہ کے لوگوں نے اس دعوت پر لبّیک کہا اور یوں دو محاذ بالمقابل قائم ہو گئے۔ جب اربابِ سطوت و اقتدار کا جور و استبداد حد سے بڑھ گیا اور اس امر کا یقین ہو گیا کہ ان کا ناسور لاعلاج ہے تو مکافاتِ عمل کے اٹل قانون کے ماتحت حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کو کشتی میں سوار کر کے بچا لیا گیا اور باقی سب نذرِ طوفان ہو گئے۔ مخالفین میں حضرت نوحؑ کا اپنا بیٹا بھی تھا اور آپ کی بیوی بھی۔ لیکن انہیں نبی کی قرابت داری اس ہلاکت و تباہی سے نہ بچا سکی جو ان کی سرکشی کا نتیجہ تھا۔ قرآنِ کریم نے یہ کہہ کر کہ وہ درحقیقت حضرت نوحؑ کے "اہل" میں سے نہ تھے، دنیا میں انسانوں کی تقسیم کا ایک ایسا بنیادی اصول سامنے کر دیا ہے جس نے نسلی، جغرافیائی، لسانی، وطنی حدود و قیود کو مٹا کر ساری تقسیم و تفریق حزب اللہ اور حزب الشّیطان کے اصول پر رکھ دی ہے۔

قصۂ حضرت نوحؑ کی تفاصیل تورات میں بھی ہیں۔ لیکن ان تفاصیل کو دیکھنے سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ ان میں ذہنِ انسانی کی افسانہ طرازیوں نے کس درجہ دخل اندازی کی ہے اور یوں آسمانی تعلیم کو کس طرح مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔

"طوفان" کا تذکرہ قریب قریب دنیا کی ہر قوم کے اساطیر الاوّلین میں پایا جاتا ہے۔ اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ مزید تاریخی تحقیقات اور اثری انکشافات تمام روئے زمین کی آبادی کی اصل کو شاید

اس خطہ کی طرف مرکوز کردیں جس میں طوفانِ نوحؑ برپا ہوا تھا۔

اس مقام پر یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ حضرت نوحؑ نے جس تعلیم کی دعوت دی اس کی مخالفت قوم کے اربابِ دولت واقتدار کی طرف سے ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ تعلیم محض "خدا کی پرستش" کے متعلق ہوتی تو اس کی مخالفت خصوصیت سے اربابِ دولت واقتدار کی طرف سے کیوں ہوتی۔ "پرستش کے معاملہ میں تو عوام" سب سے زیادہ متشدد ہوتے ہیں یہ مخالفت ان کی طرف سے ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن قرآن بتاتا ہے کہ عوام تو اس دعوت کے ساتھ تھے اور اوپر کا طبقہ اس کا مخالف تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ دعوت ایسی تھی جس سے اربابِ دولت واقتدار کے مفاد پر زد پڑتی تھی۔ اس لئے وہ اس کی مخالفت میں ایڑھی چوٹی کا زور لگاتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرات انبیائے کرامؑ جس انقلاب کی طرف دعوت دیتے تھے اس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ رزق کے سرچشموں کو افراد کے پنجے سے چھڑا کر قانونِ خداوندی کے تابع کردیا جائے تاکہ وہ تمام نوعِ انسانی کی پرورش کا ذریعہ بن سکیں۔ یہی وہ دعوت ہے جس کی مخالفت ہمیشہ اربابِ حکومت اور سرمایہ دار طبقہ کی طرف سے ہوتی رہی اور ہوتی رہے گی۔ قرآن نے سب سے پہلی دعوت میں اس کشمکش کا ذکر کیا ہے اور یہی کشمکش اس کے بعد ہر دعوت میں نظر آئے گی۔